حرف آغاز

محمد اعجاز الحق

میرے لئے جنرل محمد ضیاء الحق شہید کی ذات، شخصیت یا کارناموں کے بارے میں کچھ کہنا خاصا مشکل ہے اور اس کی کئی وجوہات ہیں: پہلی وجہ تو باپ اور بیٹے کا وہ مقدس رشتہ ہے، جو ہمارے مذہب اور مشرقی روایات میں کسی طرح کے تبصرے یا تجزیئے کی اجازت نہیں دیتا۔ دوسری وجہ اسی خونی رشتے کے حوالے سے وہ نفسیاتی اور جذباتی کیفیت ہے، جو جنرل صاحب کے بارے میں کچھ کہتے یا لکھتے وقت میرے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ یوں بھی جنرل محمد ضیاء الحق شہید، اعجاز الحق یا اپنے خاندان کے کسی اور فرد کی قصیدہ خوانی کی محتاج نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں جو مرتبہ اور مقام عطا کیا ہے، تاریخ صدیوں میں کسی کی جھولی میں ڈالتی ہے۔ دنیا ان کے تدبر کو خراج تحسین پیش کرتی ہے۔ عالم اسلام ان کی قیادت کا معترف ہے اور پاکستانی عوام کی بہت بھاری اکثریت ان سے گہری عقیدت و محبت کا رشتہ رکھتی ہے۔

مجھے آج بھی یاد ہے کہ ہم لوگ، مقامی انتظامیہ اور پاک فوج کے افسران جب جنرل صاحب کی نماز جنازہ کے انتظامات کر رہے تھے تو چار پانچ ہزار افراد کے لئے شامیانوں اور دریوں کی بات ہو رہی تھی لیکن جب ہم فیصل مسجد کی طرف روانہ ہوئے تو گلیوں اور سڑکوں سے امنڈنے والے تمام سیلابی ریلوں کا رخ فیصل مسجد کی طرف تھا اور تا حد نظر پھیلے لاکھوں عوام کے بے مثال اجتماع نے ایک عالم کو حیران کر دیا۔ جس لمحے میرے والد محترم کو قبر میں اتارا گیا، اس لمحے ایک نیا ضیاء الحق جنم لے چکا تھا۔ یہ نیا ضیاء الحق نہ چیف آف آرمی سٹاف ہے، نہ مارشل لا ایڈمنسٹریٹر اور نہ صدر مملکت لیکن یہ نیا ضیاء الحق کروڑوں افراد کے دلوں میں اسلام کے مجاہد، جہاد افغانستان کے سالار اعظم، کمیونزم اور سوویت یونین کے فاتح، اسلامی اقدار کے پاسبان،

غیرت مند اور باوقار پاکستان کے معمار، غریبوں، معذوروں اور ناداروں کے ہمدرد، امانت و دیانت کے پیکر اور عاشق رسول ﷺ کی حیثیت سے زندہ ہے۔ اس ضیاء الحق کو کوئی گزند نہیں پہنچایا جا سکتا۔ اس کے طیارے پر کوئی میزائل نہیں داغا جا سکتا اور اس کی حکمرانی کو کبھی زوال نہیں آ سکتا۔

سیاست کی وادی میں قدم رکھنے اور اپنے اہل وطن سے ملنے کے بعد میں ایسے ایسے حیرت انگیز تجربوں سے گزرا ہوں جو بلاشبہ میری زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ کہلا سکتے ہیں۔ میں پاکستان کے کسی شہر، کسی گاؤں، کسی قصبے، کسی بستی، کسی محلے میں جاؤں، لوگ میرے ہاتھ چومتے اور میری راہوں میں بچھے جاتے ہیں۔ میری مائیں، بہنیں دعاؤں کی چادریں پھیلائے کھڑی ہوتی ہیں۔ ان کی آنکھوں میں محبت اور عقیدت کے چراغ روشن ہوتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ دور دراز سے آنے والے میرے بھائی اور بزرگ اعجاز الحق کے نہیں، ضیاء الحق شہید کے بیٹے کے ہاتھ چومتے ہیں۔ میری مائیں اور بہنیں، اعجاز الحق کو نہیں اس ضیاء الحق کے بیٹے کو دعائیں دیتی ہیں جس نے چادر اور چار دیواری کے تحفظ کا تصور دیا اور جس نے غریب پروری کی روشن مثالیں قائم کیں۔ مجھے یہی عقیدت و محبت بیرون ملک مقیم پاکستانیوں سے بھی ملتی ہے جو ضیاء الحق شہید ہی کے حوالے سے مجھے عزت و وقار دیتے ہیں۔ اسلامی ممالک کے حکمران، مسلمانوں کی عالمی تنظیمیں، کشمیر اور افغانستان کے مجاہدین اور پاکستان میں مقیم اسلامی ممالک کے سفیر مجھے ملتے ہیں تو میں صاف محسوس کر رہا ہوتا ہوں کہ ان کے دل و دماغ میں کس شخصیت کا تصور ہے اور وہ مجھے جو احترام دے رہے ہیں، اس کا اصل حوالہ کیا ہے۔

میں جنرل محمد ضیاء الحق شہید کا فرزند ہونے کے ناتے ان کی شخصیت اور کارناموں کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن اتنی بات ضرور کہوں گا کہ جو لوگ اپنے عوام کے دلوں میں زندہ رہتے ہیں، جن کی یاد مسلسل منائی جاتی ہے، جن کا نام عظمت کردار کی علامت بن جاتا ہے اور

جن کے تذکرے پھولوں کی خوشبو کی طرح موجود رہتے ہیں، ان پر یقیناً اللہ تعالیٰ کا خصوصی انعام ہوتا ہے۔ شہید ضیاء الحق ہماری تاریخ کی ان خوش نصیب ہستیوں میں شمار ہوتے ہیں، جنہیں عوام کی عقیدت و محبت کی لازوال دولت نصیب ہوتی ہے۔ ان کی نماز جنازہ میں لاکھوں افراد کی شرکت، فیصل مسجد کے احاطے میں ان کا مزار، ہر لمحے مزار پر موجود رہنے والے لوگوں کی دعائیں، خانہ کعبہ اور مسجد نبوی میں ان کی غائبانہ نماز جنازہ، ہر سال ان کی برسی پر لاکھوں افراد کا اظہار عقیدت اس بات کی دلیلیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے شہید کو بلند درجات عطا کئے ہیں اور ان کے نام کو دعاؤں کا محور بنا دیا ہے۔ کوئی بھی حکمران زور بازو کے ساتھ یہ سعادت حاصل نہیں کر سکتا۔ یہ خدا کی دین ہے۔

جب کبھی میں اپنے عظیم والد کی شخصی زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو میرا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے۔ ان کے مزاج کی سادگی، ان کی قوت برداشت، ان کا تحمل، ان کی دیانت داری، اسلام کے ساتھ ان کی بے مثال وابستگی، ان کا عشق رسولؐ، ان کی عبادت گزاری، ان کی کسر نفسی، ملازموں اور ماتحتوں کے ساتھ ان کا حسن سلوک، غرض ان کی شخصیت کے جس بھی پہلو پر غور کرتا ہوں، میرے دل میں ان کی عظمت کا احساس کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔ میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ وہ کٹر مخالفین کے بارے میں بھی ایسا رویہ اختیار نہیں کرتے تھے جو اخلاقی اقدار کے مطابق نہ ہو۔

ایک شخص نے بڑی تگ و دو کے بعد جنرل صاحب سے ملاقات کی اور حکومت کی مخالف ایک معروف سیاسی شخصیت کے متعلق کچھ تصاویر اور کیسٹیں پیش کرنا چاہیں۔ اس شخص کا خیال تھا کہ جنرل صاحب ایک سیاسی مخالف کے بارے میں ایسا مواد پا کر بہت خوش ہوں گے لیکن میرے والد کا چہرہ غصے سے تمتمانے لگا۔ انہوں نے یہ کہتے ہوئے اس شخص کو کمرے سے نکال

دیا کہ ''یاد رکھو! اس قوم کی ہر بیٹی میری بیٹی ہے''۔کئی بار نامور صحافی اور دانشور انہیں ملنے آتے۔ خوب غم وغصہ کا اظہار کرتے اور بعض اوقات باہمی احترام کے تقاضوں کو بھی بھلا بیٹھتے لیکن والدِ محترم نے کبھی برا نہ مانا۔ پورے تحمل سے ان کی بات سنتے اور ایسا تاثر دیتے جیسے انہیں یہ سب کچھ جان کر خوشی ہوئی ہو۔ہمیں ہمیشہ محنت مشقت کرنے کا سبق دیتے۔

مصروفیت کیسی ہی کیوں نہ ہو، کبھی بروقت نماز کی ادائیگی سے غافل نہ ہوتے۔ اگر ہم کسی ملازم کو''تو'' کر کے بلاتے تو خفا ہو جاتے۔قومی تاریخ میں شاید ہی کوئی ایسی مثال ملے کہ باپ ملک کا صدر ہو اور اس کی اولاد ملازمتیں کر رہی ہو۔انہوں نے شعوری طور پر پورے اہتمام کے ساتھ ہمیں حکومت کے معاملات سے مکمل طور پر دور رکھا۔کسی سرکاری معاملے میں ہمیں دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ ابا جان کے گیارہ سالہ دور میں پاکستان کے لوگ میرے اور انوار الحق کے نام سے بھی واقف نہ تھے۔ گیارہ سال تک ملک کے سیاہ وسفید کا مالک رہنے والا ضیاء الحق اس دنیا سے رخصت ہوا تو اس کے بینک میں کل جمع پونجی دو لاکھ اور چند ہزار روپے تھی۔انہوں نے ہمارے لئے کوئی کارخانہ، کوئی فیکٹری، کوئی محل، کوئی جاگیر اور کوئی بینک بیلنس نہیں چھوڑا لیکن ہمارے لئے اہل وطن کے دلوں میں وہ محبت چھوڑ گئے، جو دنیا بھر کی دولت کے عوض بھی نہیں خریدی جا سکتی۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اس حوالے سے ہم پاکستان کے ''امیر ترین افراد'' ہیں۔

ہر حکمران کے مخالفین، اسے ناپسند کرنے والے، اس کے دشمن اور اس کے نقاد بھی ہوتے ہیں۔ضیاء الحق ایک انسان تھے۔وہ عوام کے منتخب کردہ حکمران نہیں تھے بلکہ حالات کے جبر نے انہیں مارشل لاء نافذ کرنے اور ملک کو خانہ جنگی سے بچانے کا مشن سونپا تھا۔سپریم کورٹ نے

ان کے اس اقدام کی توثیق کی۔ انہوں نے اپنے طور پر ایک چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر اور صدر مملکت کی حیثیت سے معاملات کو سدھارنے کی کوشش کی۔ ان کے اقدامات سے اختلاف بھی کیا جاسکتا ہے اور ایسا کرنے والے نیک نیت بھی ہوں گے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ عمومی اعتبار سے جنرل محمد ضیاء الحق کے دور نے پاکستان کو بہت کچھ دیا۔ اسی دور میں پاکستان نے اس صدی کا عظیم ترین جہاد لڑا اور افغانستان کو روسیوں کا مقتل بنا دیا۔ اس جہاد کے نتیجے میں کمیونزم ہی دفن نہیں ہوا، سوویت یونین بھی پارہ پارہ ہو گیا۔ کشمیر کی تحریک آزادی کو نیا ولولہ ملا۔ چیچنیا اور بوسنیا میں جہادی جذبے کی آگ بھڑکی۔ مشرقی یورپ کی زنجیریں پگھل گئیں۔ دیوار برلن ٹوٹ گئی۔ دنیا بھر میں سامراجی قوتوں پر زبردست ضرب لگی۔ مسلمانوں کی جہادی تنظیمیں ایک نئے عزم کے ساتھ بیدار ہوئیں۔

خود پاکستان کے اندر اسلامی اقدار کو فروغ ملا۔ قومی زبان اور قومی لباس کو عزت نصیب ہوئی۔ بلاسود بینکاری کا آغاز ہوا۔ زکوٰۃ اور عشر کا آرڈیننس نافذ ہوا۔ اسلامی حدود کا آرڈیننس آیا۔ اسلامی نظریاتی کونسل کی تنظیم نو ہوئی۔ بین الاقوامی اور اسلامی یونیورسٹی قائم ہوئی، قیام صلوٰۃ کا قانون بنا، احترام رمضان المبارک کا آرڈیننس نافذ ہوا، بیت المال قائم ہوا، محتسب اعلیٰ کا ادارہ وجود میں آیا۔ فیڈرل شریعت کورٹ قائم ہوئی، ملازمتوں میں معذوروں کا خصوصی کوٹہ رکھا گیا۔ خاندان کی تعریف میں والدین کو بھی شامل کیا گیا۔ مطالعہ پاکستان اور اسلامی کو لازمی مضامین کا درجہ دیا گیا، علماء و مشائخ کی قدر افزائی کا اہتمام کیا گیا، قومی زبان کی حوصلہ افزائی کی گئی، ذرائع ابلاغ کو اسلامی سانچے میں ڈھالا گیا اور ان کے علاوہ متعدد ایسے اقدامات کیے گئے، جن سے اسلامی کلچر کو فروغ ملا اور یہ اثرات آج تک موجود ہیں۔ مارشل لاء کے باوجود اسی دور میں بلدیاتی انتخابات کرائے گئے اور نچلی سطح پر جمہوریت کے قیام کا اہتمام کیا

گیا۔

جنرل محمد ضیاء الحق کا عہد پاکستانی قوم کے تشخص کا عہد تھا۔ مغربی سرحد پر شدید بے چینی اور سوویت یونین کی یلغار کے باوجود کسی ایک لمحے کے لئے بھی پاکستان، بھارت کی بالادستی کے سائے تلے نہیں آیا بلکہ بھارت دباؤ کا شکار رہا۔ سارک ممالک کے تعاون سے بھارت کے گرد ایک ایسا حصار باندھ دیا گیا کہ وہ کبھی اپنی حدوں سے باہر نہ نکل سکا۔ پاکستان کی کامیاب سفارت کاری اور خارجہ امور کی ماہرانہ منصوبہ بندی نے نہ صرف بھارت کو نکیل ڈالے رکھی بلکہ اسے پاکستان کے مقابلے میں کم تر حیثیت دیئے رکھی۔ ''براس ٹیک'' مشقوں کی آڑ میں بھارت کی نیت میں فتور کا پتہ چلتے ہی ضیاء الحق نے راجیو گاندھی کے کان میں وہ بات کہہ ڈالی جس کی دہشت کے باعث چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر بھارتی افواج ہماری سرحدوں سے کوسوں دور چلی گئیں۔ اس سارے عرصے میں پاکستانی قوم کے اندر بلندی اور فخر کا احساس موجود رہا اور بھارت مسلسل پیچ وتاب کھاتا رہا۔ میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ وہ کشمیر کی آزادی کا ایک واضح پلان رکھتے تھے۔ اس پلان کے ایک حصے پر عمل شروع ہو چکا تھا، جسے بعدازاں بے نظیر بھٹو نے سبوتاژ کر دیا۔

پاکستان کے ایٹمی پروگرام کی تعمیر اور نشوونما کا کریڈٹ بھی جنرل محمد ضیاء الحق شہید کو جاتا ہے۔ بلاشبہ اس کا آغاز ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے دور میں ہوا لیکن جب بھٹو کی حکومت گئی تو صرف ابتدائی مرحلے پر کام ہوا تھا اور ہماری کل کائنات چکلالہ میں ایک دو پرانی بیرکس میں بنی چھوٹی سی لیبارٹری تھی۔ اس پروگرام کا کس طرح تحفظ کیا گیا، اسے کس طرح آگے بڑھایا گیا، کن کن افراد اور کن کن ممالک سے کن کن طریقوں سے مدد حاصل کی گئی، ایک عالیشان کیمپس کس طرح تعمیر ہوا، پورے منصوبے کو کس طرح بیوروکریسی کی جکڑ بندیوں اور سیاسی آلائشوں

سے پاک رکھا گیا، ڈاکٹر عبدالقدیر کو کس طرح مکمل آزادی اور اختیارات سے آراستہ کیا گیا، عالمی سازشوں کو کس طرح ناکام بنایا گیا، معاشی مسائل کے باوجود کس طرح ایٹمی پروگرام کو بھرپور مالی امداد دی گئی اور کس ہنرمندی کے ساتھ ایٹمی پروگرام کو حتمی مرحلے تک پہنچایا گیا، یہ ایک ولولہ انگیز کہانی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن یہ کہانی ضرور لکھی جائے گی اور پاکستان کی تاریخ اس حوالے سے ضیاء الحق کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھے گی۔

جنرل محمد ضیاء الحق شہید کا یہ کارنامہ بھی ہمیشہ یادرکھا جائے گا کہ انہوں نے پاکستان میں اس کلچر کو فروغ دیا، جو ہماری مذہبی، روحانی اور معاشرتی اقدار سے ہم آہنگ تھا۔ پاکستان کے قیام کے بعد سال ہا سال کے عمل نے دینی مدارس، علمائے کرام اور مشائخ عظام کو معاملات ریاست سے لاتعلق کردیا تھا۔ لیکن جنرل محمد ضیاء الحق کے دور میں جہاں مساجد کے کردار کو نئی تابندگی ملی، وہاں علماء و مشائخ کی قدر افزائی کی روشن روایت بھی قائم ہوئی۔ میں جانتا ہوں کہ صدر شہید مختلف امور میں علماء مشائخ سے مشورے کو کس قدر اہمیت دیتے تھے اور ان کے ساتھ کس عزت واحترام سے پیش آتے تھے۔ یہ روایت بعد میں قدرے دھندلا گئی لیکن آج بھی علماء اور مشائخ کو نظر انداز کرنا مشکل ہے۔

عالم اسلام کے ساتھ قریبی روابط اور اچھے تعلقات کو ایک مشن سمجھ کر خارجہ حکمت عملی کی عمارت اسی بنیاد پر کھڑی کرنا بھی ایک ایسا کارامہ ہے، جسے دیر تک یادرکھا جائے گا۔ مبصرین تسلیم کرتے ہیں کہ صدر ضیاء الحق کو عالم اسلام کے قائد کا درجہ حاصل ہوگیا تھا۔ انہوں نے خارجہ امور کی حکمت عملی کو ذاتی رشتہ و تعلق کے حوالے سے ایک نیا رخ دیا۔ وہ صرف سرکاری اور رسمی تعلقات پر یقین نہیں رکھتے تھے بلکہ تمام قابل ذکر راہنماؤں کے ساتھ انہوں نے ذاتی مراسم قائم کررکھے تھے۔ وہ ہفتے عشرے میں کسی نہ کسی دن فون کرکے کسی نہ کسی ملک کے سربراہ سے

حال احوال اور اہل خانہ کی خیریت کے بارے میں ضرور پوچھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں عالم اسلام کے ایک مقبول لیڈر کا درجہ حاصل ہو گیا تھا اور صدر ضیاء نے جب کبھی آواز دی، پورا عالم اسلام ان کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ جہاد افغانستان اس کی روشن مثال ہے۔

ان تمام باتوں کے باوجود نیک نیتی کے ساتھ اختلاف رائے رکھنے والے، کئی منفی پہلوؤں کا اظہار کر سکتے ہیں اور انہیں اس کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ لیکن کسی بھی حکمران کے عہد میں حقیقی کسوٹی عوام ہیں اور عوام کا فیصلہ گزشتہ نو سالوں سے مسلسل سامنے آ رہا ہے۔ اس فیصلے کی گونج کشمیر کے پہاڑوں اور وادیوں میں بھی سنائی دے رہی ہے۔ اسی فیصلے کی جھلک افغانستان کے طول و عرض میں دور دراز گھاٹیوں میں واقع کچے پکے مکانوں کے اندر دیواروں پر آویزاں جنرل محمد ضیاء الحق شہید کی تصویروں میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔

مجھے یقین ہے کہ اس کتاب میں شامل مضامین جنرل محمد ضیاء الحق شہید کی شخصیت اور کارناموں کے بارے میں قابل قدر مواد فراہم کریں گے۔

پاکستان کا سپاہی اور مدبر

ایک سوانحی خاکہ

گہرے دینی عقائد سے بہرہ ور، اسلام کے جذبہ سے سرشار اور مضبوط نظریاتی وابستگی سے استقامت حاصل کرنے والے جنرل محمد ضیاء الحق، صدر اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر آف پاکستان ایک روشن خیال اور ترقی پسند فوجی مدبر تھے، جنہیں ملت اسلامیہ کے ایک ترجمان کی امتیازی حیثیت حاصل ہوئی۔

صدر ضیاء کے سوانحی خاکہ کا مطالعہ پاکستان کے معرض وجود میں آنے کی تاریخ کے مطالعہ کے مترادف ہے جو اسلام کے جذبہ اخوت کے احیاء سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔

صدر ضیاء مشرقی پنجاب کے شہر جالندھر میں 12 اگست 1924ء کو ایک متوسط خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کی تربیت نے ان کو اسلام کے طرز حیات میں ڈھال دیا۔ انہیں اعلیٰ تعلیم کے لئے دہلی کے ممتاز تعلیمی ادارے سینٹ سٹیفن کالج میں داخل کرایا گیا۔ کالج میں اپنی تعلیمی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ وہ صوم وصلوٰۃ کی پوری پابندی کرتے تھے اور مسلمان نوجوانوں کو دین کی خدمت پر ابھارتے تھے۔

صدر ضیاء کو 1945ء میں رسالہ میں کمیشن ملا۔ یہ وہ دور تھا جب قائد اعظم محمد علی جناح کی قیادت میں پاکستان کی تحریک زور پکڑ چکی تھی۔ مسلمان سپاہی جو غیر منقسم ہندوستان کی افواج کا غالب حصہ تھے، بابائے ملت کے ساتھ پوری عقیدت اور وفاداری کے حامل تھے۔ قومی جذبے سے سرشار نوجوان ضیاء ایک بااصول افسر کے طور پر ابھرے۔ سادہ مزاج لیکن باوقار............

ان کا انداز خالصتاً سپاہیانہ تھا، جس کا دل و دماغ فرض کی ادائیگی کے لئے ہمہ وقت آمادہ رہتا ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران صدر ضیاء نے برما، ملایا اور جاوا کے محاذوں پر داد شجاعت دی۔ جنگ کے خاتمہ سے دس برس کے بعد 1955ء میں انہوں نے سٹاف کالج کوئٹہ سے گریجوایشن کی۔ انہیں اس ممتاز ادارے میں انسٹرکٹر رہنے کا شرف بھی حاصل ہوا جو متعدد ممتاز فوجی قائدین کی مادر علمی کی حیثیت سے معروف ہے۔ یہاں ان کے نظریات پروان چڑھے اور وہ ایک مسلمہ فوجی منصوبہ ساز بن گئے۔

1963ء میں وہ Jort Lavenworth کے امریکی کمانڈ اور جنرل سٹاف کالج میں زیر تربیت رہے۔ اپنے کیریئر کے ابتدائی دور میں ضیاء ایک آرمرڈ بریگیڈ کے بریگیڈ میجر اور جی ایچ کیو میں سٹاف افسر بھی رہے۔ 1965ء کی پاک بھارت جنگ میں وہ لیفٹیننٹ کرنل کے عہدہ پر فائز تھے۔ 1970ء کے عشرے کے وسط میں انہیں چیف آف آرمی سٹاف کے اعلیٰ ترین عہدے پر ترقی پانے کا اعزاز حاصل ہوا۔ یہ مرتبہ انہیں ان کی صلاحیتوں اور پیشہ ورانہ فوجی مہارت کی بنا پر عطا ہوا۔

جنرل ضیاء ایک پیشہ ور سپاہی تھے۔ لہٰذا فوجی انقلابات ان کے لئے کسی صورت پسندیدہ نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ یہ ان کے بنیادی اقدار کے تصور اور فوجی نظم و نسق کے بارے میں ان کے اعلیٰ نظریات کے منافی تھا۔ لیکن حالات کی ستم ظریفی دیکھئے کہ ان ہی بنیادی اقدار کی پاسداری کرتے ہوئے انہیں جولائی 1977ء میں پاکستان کے سیاسی بحران کے لانیخل مسئلہ کو حل کرنے کے لئے مارشل لاء کا انتہائی قدم اٹھانا پڑا تا کہ ملک کو خانہ جنگی سے بچایا جا سکے۔ صدر ضیاء نے فوجی طالع آزمائی یا 1958ء اور 1968ء کی تاریخ دہرانے کے لئے اقتدار نہیں

سنبھالا تھا بلکہ یہ کارروائی جسے ''آپریشن فیئر پلے'' کا نام دیا گیا، ملک کے سیاسی نظام کو مکمل تباہی سے بچانے اور قوم کو دوبارہ راہ راست پر ڈالنے اور اس کا شعور بیدار کرنے کے لئے کی گئی۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ سپریم کورٹ نے اپنے نومبر 1977ء کے فیصلے میں اقتدار کو فوجی ہاتھوں میں لینے کے اقدام کی ''نظریہ ضرورت'' کے تحت تصدیق کی اور اسے 1973ء کے دستور کے مطابق قرار دیا۔

دستور کالعدم قرار نہیں دیا گیا البتہ اس کی بعض دفعات پر عملدرآمد معطل کیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ صدر ضیاء اپنے اس پرخلوص اعلان پر قائم رہے کہ ''ملک میں رائے عامہ ہی کو بالادستی حاصل ہے'' اور یہ کہ ''ملک کی فلاح جمہوریت میں ہے'' ان کی مشکل یہ تھی کہ ملک میں ووٹ کے تقدس کو بحال کرنے کا فوری اقدام اٹھائیں یا اسلامی قدروں کا علمبردار، مستحکم جمہوری نظام قائم کرنے کے دوررس نتائج کے حامل پروگرام پر عمل کریں۔

صدر ضیاء کا پختہ یقین تھا کہ پاکستان اسلام کے نام پر بنا ہے اور اس کی بقا صرف اسلامی نظام کے قیام سے ممکن ہے۔ یہ ان کے ایمان کا جزو تھا۔ پاکستان کو صحیح معنوں میں اسلامی جمہوریہ بنانے کے دوررس اقدامات کی غرض سے انہوں نے ان بنیادی اصلاحات پر عمل کیا۔

1۔ تعلیمی پالیسی کی تشکیل ہو تاکہ ایک ایسی نسل پروان چڑھ سکے جو اسلامی نظریات سے سرشار ہو۔

2۔ معاشرہ کی اخلاقی حالت کو بہتر بنانے کے لئے اسلام کے قانونی نظام کا نفاذ اور اس سلسلے میں قاضی اور شریعت کورٹس کی تشکیل نیز حدود اور اسلامی سزاؤں کا نفاذ۔

3۔ اسلام کے فلاحی نظام کو نافذ کرنے کے لئے زکوۃ اور عشر کی ادائیگی کو لازمی قرار دینا اور سود سے پاک بینکنگ اور معاشی نظام کا قیام۔

ایک مخلص مسلمان اور اسلامی نظریہ حیات کے ترجمان کی حیثیت سے صدر ضیاء کی نظریں قومی افق سے پار دیکھتی تھیں۔ وہ چاہتے تھے کہ عصر حاضر کے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لئے عالم اسلام ایک جسد واحد بن جائے۔ وہ اپنے عوامی خطابات اور نجی گفتگوؤں میں عالم اسلام میں ابھرنے والی حالیہ بیداری کا ذکر بڑے پرجوش انداز میں کرتے تھے اور اس سلسلے میں امت مسلمہ کے اتحاد اور یگانگت کے لئے پاکستان کو اسلام کا قلعہ بنا کر فیصلہ کن کردار ادا کرنے کے قابل بنانے کے خواہاں تھے۔

چونکہ ان کی خواہش تھی کہ نیا دور اسلامی احکامات کا ترجمان ہو، اس لئے انہوں نے ایک نئے نظام کی راہ ہموار کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے غیر جماعتی بنیادوں پر بلدیاتی اداروں کے انتخابات منعقد کرائے تاکہ جمہوریت کی عمارت کی بنیادیں استوار ہوسکیں۔ عوامی سرگرمیوں کو صحت مند بنیادوں پر پروان چڑھانے کے لئے انہوں نے ان سیاسی طالع آزماؤں کو جانچ پڑتال کے مراحل سے گزارا جنہوں نے ماضی میں اقتدار کو غلط مقاصد کے لئے استعمال کیا تھا۔ مارچ 1985ء میں عام انتخابات غیر جماعتی بنیادوں پر منعقد کرائے گئے اور صدر ضیاء نے وہ کارنامہ سرانجام دیا جو اس سے پہلے کسی فوجی حکمران نے نہیں دیا تھا۔ یعنی انہوں نے پوری فراخدلی سے ایک باوقار اور مناسب تقریب منعقد کر کے ملک کے منتظم اعلیٰ کا منصب وزیراعظم محمد خان جونیجو کے سپرد کر دیا۔

ذاتی طور پر میرے لئے ان سے ان کے مختصر ڈرائنگ روم میں جو دبیز صوفوں، فوجی ٹرافیوں اور عالمی رہنماؤں کی تصویروں سے مزین تھا، گفتگو کرنا ایک خوشگوار تجربہ ہوتا تھا۔ اسلامی احیاء کے موجودہ اور گزشتہ تہذیبوں پر اثرات کا تذکرہ ان کا پسندیدہ موضوع تھا۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ اسلام نے مختلف ادوار میں انقلابوں کو جنم دیا ہے اور انسانی حقوق کے شعور کو ابھارا ہے۔ وہ

سمجھتے تھے کہ اشتراکیت اور سرمایہ داری کی موجودہ کشمکش میں عالم اسلام ایک ایسی تیسری قوت کی حیثیت رکھتا ہے، جو دنیا کا ایک بلند تصور پیش کرتی ہے اور ایسی صالح اقوام کے اتحاد پر مشتمل ہے جو نیک مقاصد کے اشتراک کے بندھن میں بندھی ہوئی ہیں۔ ضیاء ایک مخلص مسلمان کی حیثیت سے اس نکتہ پر زور دیا کرتے تھے۔

جب وہ وردی اتار کر شلوار قمیص اور پشاوری چپل پہن لیتے تو اپنے عہدے کے اثرات سے بالکل آزاد ہو جاتے۔ پھر وہ بڑی روح پرور گفتگو کرتے۔ اپنا نکتہ نظر واضح کرنے کے لئے کبھی اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے، کبھی دونوں ہاتھوں کو جنبش دیتے، اپنی کھب جانے والی نظریں مخاطب پر گاڑ دیتے اور ان کا لہجہ بلند ہو جاتا۔ چیف آف سٹاف ہاؤس میں ان سے خوب بحث کی جا سکتی تھی۔ ان کے کارناموں یا کوتاہیوں پر تنقید بھی کی جا سکتی تھی، جس کا وہ اپنی مخصوص مسکراہٹ سے خیر مقدم کرتے لیکن جب وہ اپنے موقف کی حمایت میں دلائل پیش کرتے تو وہ اتنے وزنی ہوتے کہ مخاطب بے بس ہو جاتا۔

صدر اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے وہ استقامت کا کوہ گراں تھے اور بدترین حالات میں بھی اپنے اعصاب پر پوری طرح قابو رکھتے تھے۔ بڑی بڑی کانفرنسوں اور فیصلہ کن اجلاسوں میں ان کے انداز میں ٹھہراؤ، دانش مندی اور حقیقت پسندی ہوتی تھی۔ یہ ان کا حوصلہ تھا کہ طویل اجلاسوں میں بڑے بڑے لفاظ اور بیان والے مقرروں کی تقاریر نہایت صبر و سکون کے ساتھ گھنٹوں سنتے رہتے تھے۔ جب بالآخر وہ بولنے کے لئے اٹھتے تو موضوع کا حق ادا کر دیتے۔ اس مرحلہ پر ان کے انداز میں شعلے کی لپک ہوتی۔ لیکن وہ باتوں کے نہیں عمل کے دھنی تھے۔ وہ اکثر دن میں سولہ گھنٹے کام کرتے اور اس دوران نہ تو ان پر تکان طاری ہوتی اور نہ وہ بوریت کا شکار ہوتے۔ انہیں زندگی سے محبت تھی اور وہ اس کے ہر دن کی قدر و قیمت جانتے

تھے۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ مرحوم ایک مشاق کھلاڑی بھی تھے اور ٹینس اور گالف کھیلتے تھے۔ وہ دو بیٹوں اور تین بچیوں کے مشفق باپ تھے۔ انہیں کتابوں سے گہرا شغف تھا اور وہ دنیا کے معاملات میں بھی کسی سے کم نہ تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کی شخصیت نہایت جاندار اور مضبوط تھی اور وہ زندگی کے چیلنجوں کا سامنا کرنے کی ہمت رکھتے تھے۔

جو بھی ان کے قریب آتا، ان کی گرمجوشی کو محسوس کرتا اور وہ اس کے لئے معاملات کو بہت سادہ اور آسان بنا دیتے۔ وہ اعتماد کا پیکر تھے اور انہیں اپنے اوپر پورا بھروسہ تھا۔ وہ معاملات کا روشن پہلو دیکھتے اور ان کا یقین تھا کہ پاکستان مشکلوں کے بھنور سے نکل کر ہر طوفان کا مقابلہ کرے گا اور بالآخر پوری اسلامی دنیا کے لئے مضبوط ستون ثابت ہوگا۔ ان کی ذات میں عالم اسلام کو نہ صرف ایک فوجی مدبر مل گیا تھا بلکہ ایک ایسا قائد جس کی نگاہ بلند تھی اور جو عمل کا پیکر تھا۔ وہ اس ملت اسلامیہ کے اتحاد کا علمبردار تھا، جو اس تیزی سے تغیر پذیر دنیا میں فیصلہ کن کردار ادا کرنے کی اہلیت رکھتی ہے۔

صدر ضیاء الحق کے وجود کا احساس ان کے اختیارات سے دستبردار ہو جانے کے باوجود پوری طرح موجود تھا۔ یہ اس لئے کہ اس کا سرچشمہ کوئی عہدہ یا منصب نہ تھا بلکہ ان کی سادہ اور سیدھی سادی شخصیت تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ ایک مقبول قائد میں ڈھل گئے تھے اور ان کی مقبولیت اسلام اور پاکستان سے ان کی گہری وابستگی اور اس کا گھمبیر شعور تھا جس کا وہ لگی لپٹی رکھے بغیر ایسی روانی اور بیان کے ساتھ اظہار کرتے تھے کہ سننے والے دنگ رہ جاتے تھے۔ وہ ایک ایسی قوت تھے، جسے نہ صرف قومی منظر میں اور نہ بین الاقوامی حالات میں نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔

ان کے متعدد کارناموں میں سرفہرست افغانستان پر روسی حملہ کے بعد ان کا طرز عمل ہے۔

جس کے نتیجے میں ان کے نام نامی کو افغانستان سے کسی طرح جدا نہیں کیا جا سکتا۔ وہ تاریخ میں افغانستان کی آزادی کے محافظ کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ (افغانستان کے دوسرے ہیرو اور ان کے رفیق کار جنرل اختر عبدالرحمٰن بھی اسی فضائی حادثہ میں شہید ہوئے، جس میں صدر ضیاء کو شہید کیا گیا) افغانستان کی آزادی ہمارے عہد کا عظیم ترین کارنامہ ہے۔ جس کے اسلام کے احیاء کی تحریک پر غیر معمولی اثرات مرتب ہوں گے۔

صدر ضیاء الحق 17 اگست 1988ء کو تخریب کاری کے نتیجہ میں وقوع پذیر ہونے والے ایک فضائی حادثے میں شہید ہو گئے اور انہیں 20 اگست کو عظیم الشان فیصل مسجد کے احاطے میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ لوگوں کے اذہان اور قلوب پر ان کی حکمرانی کا اظہار اس ہجوم کی تعداد ار نوعیت سے بھرپور طریقے پر ہوا، جو ان کے جنازے کے موقع پر جمع ہوا۔ فیصل مسجد کے گرد میلوں میل تک لوگوں کا ایک سمندر تھا جس کی تعداد دس لاکھ سے زیادہ تھی۔ یہ لوگ دور دراز سے صرف شہید ضیاء الحق کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے جمع ہوئے تھے۔ صدر ضیاء اسلام اور قوم کی خدمت سر انجام دیتے ہوئے اپنی وردی میں شہید ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ضیاء ...... میں نے انھیں کیسا پایا؟

میاں محمد نواز شریف

جنرل محمد ضیاء الحق کی شخصیت کے بارے میں کچھ لکھنا ایک کٹھن کام ہے۔ان کی شخصیت ہمہ پہلوتھی اور قدرت نے ان کی طبیعت کو انکسار، شفقت، انسانیت کی محبت، زیردستوں معذوروں اور ضرورت مندوں کے لئے احساس کا ایک دلکش امتزاج ودیعت کیا تھا،ان ہی خوبیوں کی بنا پر وہ لوگوں میں مقبول تھے۔لیکن جہاں ایک طرف ان کی طبیعت کا یہ شبنمی انداز تھا دوسری طرف وہ قیادت اور استقلال کی صفتوں سے بھی متصف تھے اور جہاں اصولوں کی پاسداری، یا ملکی مفاد کا تقاضا ہوتا وہ مانند فولاد ثابت ہوتے اور کوئی سمجھوتہ نہ کرتے اور ان کی طبیعت کے بے شمار پہلو تھے اور ان میں ہر پہلو کا حق ادا کرنا خاصا مشکل ہے۔یہ کام مجھ جیسے شخص کے لئے اور بھی دقت طلب ہے کیونکہ مجھے ان کی جامع ہستی کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا ایک طرف تو کہا جاتا تھا کہ کسی واقعہ یا شخصیت کا تجزیہ بالکل غیر جانبدارانہ ہونا چاہئے اور یہ کام وہ شخص نہیں کر سکتا جو اسی شخصیت سے گہری عقیدت رکھتا ہو یا اس دور میں شریک عمل رہا ہو لیکن سوال کیا جا سکتا ہے کہ جن لوگوں کا زندگی کے مدوجزر اور زیر سطح لہروں سے تعلق رہا ہو اگر وہ تاریخ رقم نہ کریں گے تو اور کون کرے گا۔اس زاویہ نظر سے دیکھا جائے تو میں بیک وقت اس شخصیت کے بارے میں کچھ کہنے کا حقدار ہوں بھی اور نہیں بھی جس نے گیارہ سال پاکستان کی زمام کار سنبھالے رکھی اور اسی کی خدمت میں اپنی جان دے دی۔

پس منظر

صدر ضیاء الحق کے کارناموں اور انہیں پیش آمدہ مشکلات کا جائزہ لینے سے پہلے ان کی

زندگی کے پس منظر کا تذکرہ ضروری ہے۔وہ نہ تو کوئی جاگیردار تھے نہ ہی صنعت کار نہ ہی وہ منہ میں چاندی کا چمچہ لے کر پیدا ہوئے تھے۔ان کا خاندان نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھتا تھا اور انہوں نے بتدریج اور مسلسل محنت، ذہانت اور جرات سے کام کر کے ملک کا اعلیٰ ترین منصب حاصل کیا۔اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ نسبتاً غریب پس منظر کے حامل تھے بلکہ اس لئے بھی کہ انہیں دنیا کے مال ومتاع کا لالچ نہ تھا۔ یہ جذبہ انہیں اسلام کے دین متین میں گھرے یقین نے عطا کیا تھا جو بچپن سے ان کی شخصیت پر پوری طرح حاوی رہا تھا۔انہیں یہ تعلیم ملی تھی اور جسے انہوں نے روح کی گہرائیوں سے قبول کیا تھا کہ قادر مطلق کے نزدیک عظمت کا معیار انسان کی دنیوی مال ومتاع نہیں بلکہ اس کا تقویٰ ہے۔ایک مرتبہ انہوں نے اپنی چوسٹھویں سالگرہ پر مجھے مخاطب کر کے کہا ’’میں جلد اپنے خالق حقیقی کے پاس جانے والا ہوں جب وہ مجھ سے سوال کرے گا کہ میں کیا عمل اپنے ساتھ لایا ہوں تو میں کیا جواب دوں گا۔ میں تو ایک گنہگار انسان ہوں‘‘۔وہ ہمہ وقت اس احساس سے سرشار رہتے تھے کہ اسلام کی ترجمانی دنیا بھر کے بدلتے ہوئے حالات اور سائنس اور ٹیکنالوجی میں رونما ہونے والے ارتقاء کی روشنی میں کرنا چاہئے۔ اقبال کی طرح دور جدید میں اسلامی افکار کی تشکیل نو میں یقین رکھتے تھے۔

بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ ضیاء جاہ پرست تھے۔اس سے زیادہ غلط بات ہو ہی نہیں سکتی۔ بدقسمتی سے ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم بہت جذباتی لوگ ہیں اور زندگی کے حقائق اکثر ہمارے پیش پاافتادہ تصورات کی دھند میں کھوجاتے ہیں اور حقائق کی تلخی صرف نظر کا شکار ہوجاتی ہے۔

آیئے تاریخ کے اس نازک موڑ کا جائزہ لیں جب ضیاء نے اقتدار سنبھالا۔اس دور کی حزب اختلاف نے الیکشن میں دھاندلی کے خلاف ایک زبردست تحریک شروع کر رکھی تھی اور صاف اعلان کر دیا تھا کہ وہ منتخب مقننہ کو کسی طرح بھی کام نہ کرنے دیں گے۔حکمران پارٹی ان

الزامات سے منکر تھی اور اسمبلیوں کا اجلاس منعقد کرنا چاہتی تھی۔ اختلافات کی خلیج اتنی وسیع ہوگئی کہ سول حکومت بھی کراچی اور لاہور میں مارشل لاء لگانے پر مجبور ہوگئی۔ ادھر ہائی کورٹ نے مارشل لاء کے نفاذ کو خلاف قانون قرار دے دیا۔ اب ملک ایک گہری کھائی کے کنارے پہنچ گیا تھا۔ اس دور کا دستور اس طرح مرتب کیا گیا کہ صدر فضل الٰہی جنہیں ایک طرح حکمران پارٹی نے نامزد کیا تھا سارے معاملات کو ایک خاموش تماشائی کی حیثیت سے دیکھنے پر مجبور تھے (کچھ لوگ چاہتے تھے کہ دستور کی یہی کیفیت بحال کردی جائے) وہ نہ تو کوئی دخل اندازی کرسکتے اور نہ الجھے ہوئے حالات کو سنوارنے کے لئے کوئی کردار ادا کرسکتے تھے کیونکہ ان کا عہدہ محض آرائشی حیثیت رکھتا تھا اور اختیارات سے محروم تھا۔

ایسی صورت میں مسئلہ کا حل کیا ہوسکتا تھا؟ جو لوگ مجرد قانونی نکتہ نظر سے مسئلہ کو دیکھتے ہیں وہ بھول جاتے ہیں کہ قانون کا نفاذ بہرحال پاکستان کے لئے ہونا چاہئے اور اس وقت تو پاکستان کا وجود ہی خطرے میں پڑ چکا تھا۔ ضیاء کی باضمیر فطرت انہیں اس بات کی اجازت نہیں دے سکتی تھی کہ ملک کے ارتقاء کا سلسلہ رک جائے جس کا جغرافیائی، معاشی اور نظریاتی وجود ہی معرض خطر میں پڑ چکا تھا۔ ان کا تو مرنا جینا ہی پاکستان کے لئے تھا۔ انہوں نے ایک مرتبہ مزاحاً فرمایا تھا ''میں پاکستان کا بہترین سیلز مین ہوں''۔

بحیثیت مدبر

بہت تھوڑے لوگ یہ تصور رکھتے تھے کہ صدر ضیاء قومی اور بین الاقوامی سطح پر انسانی معاملات کو نپٹانے کے لئے اتنی پیش بینی، سوجھ بوجھ اور مہارت کا مظاہرہ کرسکتے ہیں۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مبصرین کو ان کی دل ودماغ کی اعلیٰ صلاحیتوں کا قائل ہونا پڑا۔ جب انہوں نے ملک کی زمام کار سنبھالی تو بھارت کی روایتی مخالفت کا سامنا تھا جس کے مضمرات 1971ء کے

روس بھارت سمجھوتے کے بعد بہت بڑھ چکے تھے اور ابھی وہ بھارت کی قیادت سے آزادی کے باہمی احترام پر مبنی تعلقات استوار کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ روس نے افغانستان پر حملہ کر دیا۔ اب پاکستان مشرق اور مغرب دونوں طرف سے گھر چکا تھا۔ پاکستان ایک سپر پاور اور منی سپر پاور کے درمیان سینڈوچ بن گیا تھا۔ بہت سے لوگوں کا طرز فکر یہ تھا کہ پاکستان کو خواہ مخواہ خطرات مول نہیں لینے چاہئیں اور افغانستان کے بارے میں وہی پالیسی اختیار کرنا چاہئے جس پر بھارت عمل کر رہا تھا۔ غرضیکہ ان کی رائے میں پاکستان کو بہت محتاط رہنا چاہئے تھا۔ ایک کثیر تعداد کی طرف سے اس رائے کا اظہار بھی کیا گیا کہ حملہ افغانستان پر ہوا ہے پاکستان پر تو نہیں۔ تو پھر پاکستان کیوں خواہ مخواہ پریشان ہو رہا ہے؟ لیکن اس نوعیت کی تمام دلیلیں، دباؤ کے حربے، اخباری رپورٹیں، مختلف تنظیموں کی قراردادیں اور ڈپلومیٹک پریشر صدر ضیاء پر ذرہ برابر اثر بھی نہ ڈال سکے۔ انہوں نے ہر دلیل کا جواب یہ کہہ کر دیا کہ اگر میرے گھر کے پچھواڑے کسی خاتون کو مجرمانہ حملے کا نشانہ بنایا جا رہا ہو تو کیا مجھے صرف ایک خاموش تماشائی کا کردار ادا کرنا چاہئے؟

افغانستان کے بارے میں پاکستان کی پالیسی کی ساخت پرداخت اور اس پر عمل درآمد صدر ضیاء نے خود کیا۔ انہوں نے یہ عزم کر رکھا تھا کہ ایک عالمی طاقت کی طرف سے افغانستان پر ناجائز قبضہ کی مخالفت ہر ممکنہ انداز اور ہر ایسے فورم پر کی جائے جس کا تصور بھی کیا جا سکتا ہو۔ انہوں نے عالمی ذرائع ابلاغ سے اپیل کی کہ وہ افغانستان کو اولین فوقیت دیں اور اسے نمایاں ترین مقام کا مستحق گردانیں۔ وہ چاہتے تھے کہ اس طرح عالمی ضمیر کو بیدار کیا جائے اس پالیسی کے تشکیل پانے کے پورے اٹھارہ ماہ بعد واشنگٹن کی توجہ اس کی طرف مبذول ہوئی۔ کارٹر انتظامیہ کی جانب سے ابتدائی پیشکش 400 ملین ڈالر کی تھی۔ صدر ضیاء نے اسے انتہائی حقیر

قرار دیتے ہوئے انگریزی محاورے Peanuts کہا تو دنیا بھر کے اخبارات میں ہلچل مچ گئی۔ پھر دنیا نے دیکھا کہ وہی امریکہ جس نے پاکستان کی جانب سے سرد مہری کا رویہ اختیار کر لیا تھا کیونکہ اس میں جمہوریت پر عملدرآمد نہیں ہو رہا تھا اور اسے اس کے ایران کے نقش قدم پر چلنے کے خطرات کے پیش نظر امریکی دستور کی سمنگٹن ترمیم کی روح کے برعکس پالیسی کا نشانہ بنا رکھا تھا اب اس پورے علاقے کو ایک مختلف پس منظر میں دیکھ رہا ہے۔ امریکہ سے وفود کی آمد شروع ہوئی جس کے نتیجہ میں پاکستان کے امریکہ کے تعلقات میں استحکام پیدا ہوا چنانچہ ایک طرف تو پاکستان کی قوت میں اضافہ ہوا دوسری طرف اسے عالمی ایوانوں میں قدر و منزلت کی نظروں سے دیکھا جانے لگا۔ صدر ضیاء نے دنیا بھر سے اپیل کر کے جو پیغام دیا اسے دنیا کے طول و عرض میں مقام دیا گیا۔ چند ممالک کو چھوڑ کر دنیا کی اکثریت نے ان کی اپیل کا مثبت جواب دیا جس کا اظہار قابل عزت اقوام متحدہ، غیر وابستہ تحریک، اسلامک کانفرنس، ASEAN اور دیگر عالمی تنظیموں پر رائے شماری کے انداز سے ہوتا رہا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ روس کو وہ فیصلہ کرنا پڑا جو تاریخ میں اس نے اسے پہلے کبھی نہیں کیا تھا اور وہ تھا کہ ایک مقبوضہ علاقے سے اپنی افواج کی واپسی۔ اس کے فوراً بعد ضیاء نے ڈور کا اگلا سرا تھام کر افغانستان میں ایک وسیع البنیاد حکومت کے قیام کی کوشش شروع کر دی۔ اب ان کی سوچ کا انداز مختلف تھا۔ وہ چشم تصور سے دیکھ رہے تھے کہ اگر اسلامی جمہوریہ ایران اور اسلامی جمہوریہ پاکستان ایک حقیقی افغانستان کے ساتھ مل کر ایک متحدہ بلاک بنا لیں تو یہ ایک مضبوط طاقت کے طور پر ابھرے گا اور نہ صرف امن کے قیام میں اہم کردار ادا کر سکے گا بلکہ اسلام کی اشاعت میں خصوصاً ممد و معاون ثابت ہو گا۔ ضیاء کے اس خواب کی تعبیر کب حقیقت میں ڈھلے گی اب یہ کہنا مشکل ہے۔

ضیاء اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ ان کے اصولی موقف کا تمام اثر پاکستان کی مغربی سمت

میں تھا اس لئے انہوں نے بھارت سے اپنے تعلقات کو پوری احتیاط سے ہر خطرے سے محفوظ رکھنے کا اہتمام کیا۔ دنیا جانتی ہے کہ انہوں نے کرکٹ ڈپلومیسی اور پر امن بقائے باہمی کی پیش کشوں کے ذریعے کس طرح اپنی مشرقی سرحدوں کو محفوظ رکھا۔ اس سلسلے کا اہم پہلو یہ ہے کہ اگرچہ انہوں نے بھارت کے ساتھ تعلقات پر کوئی آنچ نہیں آنے دی انہوں نے اصولوں پر کہیں بھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ وہ بھارت سے دوستانہ اور پر امن تعلقات تو چاہتے تھے لیکن اس کے بالادستی کے رجحانات کو پروان چڑھنے دینا انہیں گوارہ نہ تھا۔ ان کا موقف تھا کہ چھوٹے بڑے تمام ممالک کو مساوی مقام ملنا چاہئے اور انہیں ایک دوسرے کی آزادی کا احترام کرنا چاہئے۔

جب روسی فوجوں کی واپسی کے بعد کابل میں نئی حکومت کی تشکیل کا مسئلہ سامنے آیا تو انہوں نے لگی لپٹی رکھے بغیر کہہ دیا کہ بھارت بڑا ملک ہو یا چھوٹا اس کی کوئی بھی اہمیت ہو آٹھ برس اس نے افغانوں کے بارے میں چپ سادھے رکھی اور ہماری مسلسل استدعا کے باوجود ہماری مدد نہیں کی اب اس کا افغانستان کے معاملات میں دخل دینا اور روسی افواج کے بعد کسی قسم کی کارروائی کرنا بالکل ناممکن ہے اور اسے اس سے کوئی واسطہ نہیں ہونا چاہئے۔

مسلح افواج

اس پالیسی پر عمل درآمد کرتے ہوئے ضیاء اس حقیقت سے بھی باخبر تھے کہ بین الاقوامی محاذ پر کامیاب ڈپلومیٹک مساعی فوجی طاقت کا نعم البدل نہیں ہوسکتی بلکہ درحقیقت غیر ملکی تعلقات میں جو بھی حکمت عملی اپنائی جائے وہ ملک کی فوجی قوت ہی کی ایک توسیع ہوتی ہے دونوں پر بیک وقت توجہ دینا ضروری ہے اس لئے کہ ان کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہر وہ شخص جو پاکستان کے حالات سے باخبر ہے بلا جھجک اعتراف کرے گا کہ پاکستان کی افواج 1977ء کے مقابلے میں فوجی قوت کے اعتبار سے بہت بااثر حیثیت کی حامل ہیں۔ ضیاء نے ان کی توسیع، ترتیب

اور حوصلہ مندی کے پہلوؤں پر بہت توجہ دی۔ وہ اپنے کمانڈروں کو یہ مشورہ دیا کرتے تھے کہ جب میں مسلسل امن کی بات کر رہا ہوں اور اس سلسلے میں حقیقی پیش رفت کے لئے کوشاں ہوں آپ سب کو ضرورت پڑنے پر مادر وطن کے دفاع کے لئے چوکنا رہنے اور یہ فریضہ بطریق احسن سرانجام دینے کے قابل ہونا چاہئے۔ چنانچہ وہ افواج پاکستان کے استحکام کے سلسلے میں سرگرم عمل تھے جب انہیں خالق حقیقی کی طرف سے بلاوا آ گیا۔

اقتصادی پالیسی

صدر ضیاء کی اقتصادی پالیسیاں جہاں ایک طرف سرمایہ کاری میں اضافے، صنعتی ترقی اور معاشی استحکام کو پیش نظر رکھ کر ترتیب دی گئی تھیں وہاں ان کا زور سرمایہ کی منصفانہ تقسیم پر بھی تھا۔ وہ ایک فلاحی معاشرے میں پکا اور سچا یقین رکھتے تھے اور چاہتے تھے کہ ملک کے معاشی نظام میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو ممکنہ خوشحالی نصیب ہو۔ ملک میں پہلی مرتبہ زکوٰۃ اور عشر کا تصور متعارف ہوا اور اس سمت میں اٹھائے گئے اقدامات کے نتیجے میں ملک کے محروم طبقوں کی حالت میں خاص بہتری رونما ہوئی۔ ہزاروں بیواؤں، یتیموں، معذوروں، بوڑھوں اور بے دست و پا یا مجبور لوگوں کو ان کی جاری کردہ سکیموں کے نتیجہ میں آج بھی فائدہ پہنچ رہا ہے۔ یہ سکیمیں بنیادی طور پر اسلام کے قوانین کے تحت خوشحال طبقوں پر اضافی ٹیکس کی حیثیت رکھتی ہیں تاکہ بے سہارا کمزور اور مفلوک الحال لوگوں کی مدد کی جا سکے۔ وہ زور دے کر کہا کرتے تھے کہ ان کی پالیسی کا مقصد عدل و انصاف پر مبنی معاشرہ کا قیام تھا۔ صدر ضیاء ہمارے درمیان نہیں لیکن بے شمار لوگ ان کے اس سمت میں اٹھائے گئے قانونی اقدامات سے استفادہ کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے جنازے میں لاکھوں ایسے افراد شریک ہوئے جن کی آنکھیں غم اور شکرگزاری کے جذبات سے غمناک تھیں۔

سیاسی نظام

حیرت کی بات ہے کہ مغربی اور ملکی ذرائع ابلاغ نے ان کی وفات کے فوراً بعد جلد بازی میں ہی سطحی اور ظالمانہ فیصلہ دے دیا ہے کہ وہ ایک ایسے ڈکٹیٹر تھے جس نے کوئی نظام تشکیل نہیں دیا۔ اگر تھوڑے سے غور وفکر سے کام لیا جائے اور تحقیق کی جائے تو یہ سامنے آئے گا کہ یہ ان کا چھوڑا ہوا نظام ہی ہے جس کے تحت صدارت کا منصب سنبھالا جا رہا ہے۔ الیکشن منعقد ہو رہے ہیں۔ نئے وزیر اعظم آ رہے ہیں اور گورنر، وزرائے اعلیٰ اور وفاقی وزیر مقرر ہو رہے ہیں۔ ان کی وفات کے بعد بہرحال اب تک کوئی نئی قانون سازی نہیں ہوئی، کیا پھر بھی یہ بے بنیاد اور بلا جواز بیان دینا درست ہے کہ وہ ایک ڈکٹیٹر تھے جس نے کوئی نظام ورثے میں نہیں چھوڑا اور یہ کہ جمہوریت کی ابتدا اب ہوئی ہے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ ملک میں 1985ء سے ایک باقاعدہ نظام قائم ہے اور موجودہ حکومت اسی کی پیداوار ہے۔ اس نظام کی کارکردگی کے بارے میں شکوک وشبہات کا اظہار کیا جا سکتا ہے لیکن یہ اظہر من الشمس ہے ریاست کا کاروبار چلانے کے لئے یہ ایک مکمل ڈھانچہ مہیا کرتا ہے۔ ابلاغ عامہ کے ارباب کار اگر ذرا غور وفکر سے اس صورت حال کا جائزہ لیں تو معاملات کو سنوارنے میں مدد دے سکتے ہیں اور منطقی نتائج تک پہنچ سکتے ہیں۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ صدر ضیاء کی شخصیت کو مورد الزام ٹھہرانے، ان کے خلاف بے بنیاد الزام تراشی اور ان پر کیچڑ اچھالنے کی ایک سوچی سمجھی سازش ہے۔ اس مہم کے سرپرستوں کا کام اس لئے بھی آسان ہے کہ مردے کسی چیز کا جواب نہیں دے سکتے۔ یہاں شیکسپیئر کے ڈرامے جولیس سیزر میں انطونی کی زبان سے کہے گئے الفاظ با محاورہ یاد آ جاتے ہیں۔

(بڑے) لوگوں کی کوتاہیاں اور عیوب ان کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں۔ لیکن ان کی خوبیاں

اکثر ان کی ہڈیوں کے ساتھ ہی دفن ہو جاتی ہیں۔

ضیاء کے اس قماش کے نقاد یہ نہیں جانتے کہ صداقت لافانی ہوتی ہے۔ تقویٰ تو ظلمتوں میں بھی چمکتا ہے۔ خلوص وہ انمول ہیرا ہے جس کی حفاظت لازمی ہے، حب الوطنی وہ خوبی ہے جس کی تقلید کرنی چاہئے اور برداشت اور رحم دلی ہی میں اصل قوت پنہاں ہے۔ ضیاء تو ان تمام خصائل کا مرقع تھے۔ تاریخ کا فیصلہ یہی ہوگا۔

ایک پُریقین اور صاحبِ نظر قائد

زیڈ اے سلہری

صدر ضیاء الحق کا عوام کے ذہنوں اور زندگیوں پر کتنا گہرا اثر تھا، اس کا اظہار اس جم غفیر کی کثرت اور نوعیت سے ہوا، جو ان کے جنازے پر جمع ہوا تھا۔ یہ وہ دن تھا جب افواج پاکستان اور پاکستانی عوام نے انہیں آخری خراج عقیدت اور سلام پیش کیا۔ یہ ان کی مقبولیت کا نکتہ عروج تھا۔ اس دن جو ہجوم جمع ہوا، وہ کوئی معمول کا ہجوم نہ تھا۔ اس کی اپنی الگ خصوصیت تھی۔ یہ ہجوم عام نوعمر مرد و زن پر مشتمل نہ تھا نہ کمزور عمر رسیدہ افراد اور معصوم بچوں پر، یہ لوگ غریب دکھائی دیتے تھے لیکن یہ وہ لوگ نہ تھے جن سے ہمیں عام دیہات، چھوٹی بستیوں اور قصبوں میں واسطہ پڑتا ہے۔ یہ بالکل جداگانہ نوعیت کے لوگ تھے۔ ان کی رنگت بھی مختلف تھی۔ دھوپ کی تمازت سے پختہ اور خشک بھوری، جیسے وہ کہیں گم گشتہ انسانی ہجوم میں سے اچانک نمودار ہو گئے ہوں اور جنہیں اس سے پہلے شہروں میں کبھی نہ دیکھا گیا ہو۔ ظاہر ہے کہ ان لوگوں کا دور دراز سے جمع ہونے کا صرف ایک مقصد تھا اور وہ تھا شہید ضیاء الحق کے لئے اظہار عقیدت۔ ان لوگوں کا نامعلوم مقامات سے قومی زندگی کے مرکزی گہوارے یعنی وفاقی دارالحکومت......فیصل مسجد......میں یوں نمودار ہو جانا ظاہر کرتا تھا کہ صدر ضیاء کی شخصیت کے اثرات پاکستان کے طول و عرض میں کس گہرائی تک پہنچے ہوئے تھے۔ ان کو جاننا تو درکنار، ان لوگوں نے انہیں کبھی دیکھا بھی نہ تھا۔ انہوں نے بس ان کا نام سنا تھا اور ان کے ذہنوں میں اسلام پاکستان اور افغانستان کے لئے ان کی خدمات کا ایک دھندلا تصور تھا۔ البتہ انہیں یہ یقین تھا کہ وہ ایک نہایت نیک شخصیت تھے۔

اس دن شہید کی جس غیر معمولی مقبولیت کا اظہار ہوا، اس کی دو وجوہات ہوسکتی ہیں۔ ایک وجہ تو یہ تھی کہ ان کی شخصیت بالکل سیدھی سادی تھی۔ اس حد تک کہ اس کے گرد صدارت کے منصب پر فائز ہونے کے باوجود کوئی چمک دمک نہیں دکھائی دیتی تھی۔ وہ دوسروں پر حکم چلانے والی شخصیت نظر نہیں آتے تھے۔ ان کی سادگی اس وجہ سے اور بھی نمایاں ہوجاتی تھی کہ وہ عام آدمی کا لباس، شلوار قمیض اور واسکٹ پہنتے اور اسی کی زبان میں بات کرتے۔ وہ انگریزی میں خطاب نہ کرتے جو سابق حکمرانوں کی زبان تھی بلکہ اردو میں تقریر کرتے، جسے قائداعظمؒ نے قومی زبان کا مرتبہ دیا تھا لیکن جسے ان سے پہلے کسی حکمران نے درخورِ اعتنا نہیں سمجھا تھا۔

ان کی مقبولیت کی دوسری وجہ ان کی اسلام سے مکمل وابستگی تھی۔ وہ اسلام کا ذکر کرتے ہوئے کبھی نہ تھکتے۔ یہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا اور مقصد حیات۔ (ان کے جنازے میں جمع ہونے والے لوگوں نے سنا ہوگا کہ صدر ضیاء ہی کی وجہ سے اقوام متحدہ کے ایوانوں میں اذان کی آواز گونجی اور انہوں نے دنیا کی 1150 اقوام کے نمائندوں کو اسلامی نظام زندگی کی خوبیوں کی طرف متوجہ کیا۔ یہ لوگ ضرور سوچتے ہوں گے کہ دنیا کی ملت اسلامیہ نے بین الاقوامی رائے عامہ کو اس مرکز میں اپنی نمائندگی کے لئے کسی واعظ کا انتخاب کیا تھا یا ایک صدر کا؟) بہت سے جدید ذہن کے ثقہ لوگ انہیں ''مولوی'' کا لقب دیتے تھے۔ یہ کوئی ایسا غلط بھی نہ تھا۔ وہ ایک مولوی کے گھر پیدا ہوئے اور اسلامی اقدار سے وابستگی ان کی ذات میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ لیکن وہ کوئی خالی خولی واعظ نہ تھے۔ جس چیز کی تبلیغ کرتے، اس پر پوری طرح عمل بھی کرتے۔ دنیا اِدھر کی اُدھر ہوجائے ان کی نماز قضا نہ ہوتی۔

حتیٰ کہ حکومت کے معاملات کو بھی نماز کی باقاعدگی اور بروقت ادائیگی میں حائل نہ ہونے دیتے۔ کابینہ کے اجلاس ہمیشہ تلاوت قرآن سے شروع ہوتے اور یہ سلسلہ انہوں نے ہی جس

دن اقتدار سنبھالا، اسی دن سے شروع کر دیا تھا۔ نماز کے لئے ہر اجلاس ہمیشہ برخاست ہو جاتے۔ روزانہ فرض نمازوں کا تو کیا ذکر، 26 سالوں میں ان کی نماز تہجد بھی ایک مرتبہ قضا نہ ہوئی۔ انہیں جب بھی موقعہ ملتا، وہ حرمین شریفین میں حاضر ہوتے۔ بحیثیت مجموعی وہ ایک ایسے محبّ وطن پاکستانی تھے، جسے اپنی قومیت پر کامل فخر تھا۔ وہ اس دھرتی کا ناک تھے اور ان کی شخصیت میں کوئی ایسا عنصر نہ تھا جو ان کے مزاج سے لگاؤ نہ کھاتا ہو۔

ضیاء الحق ایک شریف آدمی تھے لیکن یہ محاورہ کہ ''شرافت ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی'' ان کی شرافت کے ذکر کا حق ادا نہیں کر سکتا اس لئے کہ ان کا شرافت کا جذبہ ان کے دل و دماغ اور روح کی گہرائیوں میں رچا بسا تھا۔ یہ ان کے کردار کا اصل اصیل تھا۔ وہ اپنے کمرے میں آنے والوں کا استقبال ایک گرم جوش مصافحہ اور ایک ایسی بھرپور مسکراہٹ سے کرتے کہ ان کے چہرے کے سنگین خدوخال سے روشنی پھوٹنے لگتی۔ ملاقات کے اختتام کے بعد ملاقاتی کی گاڑی پورچ سے روانہ ہونے تک انتظار کرنا ان کا معمول تھا۔ جس پر وہ دن میں کئی مرتبہ عمل کرتے اور یہ معمول انہوں نے خود اپنایا تھا جسے انہوں نے برسوں باقاعدگی سے نبھایا۔ انہوں نے ہزاروں افراد کا اسی طرح استقبال کیا اور انہیں اسی انداز میں رخصت کیا۔

ان کی شخصیت کی غیر معمولی اور بے مثال خوبی یہ تھی کہ اپنے بلند منصب اور مختلف النوع ذمہ داریوں کی اہم مصروفیات کے باوجود وہ کسی شخص کو یہ محسوس نہیں ہونے دیتے تھے کہ وہ ان کا وقت ضائع کر رہا ہے۔ جب تک کوئی شخص بات کرتا رہتا، وہ پوری توجہ سے اسے سنتے رہتے۔ دنیا میں ایسے کتنے حکمران ہوں گے جو اپنے ملاقاتیوں سے یہ حسن سلوک اور رعایت روا رکھتے ہوں۔ جو چیز آپ کا دل مکمل طور پر جیت لیتی، وہ ان کا اپنی ننھی معذور بیٹی زین کے ساتھ دردمندانہ رویہ تھا۔

اکثر جب وہ مہمانوں یا اخبارات کے مدیروں سے کسی مسئلے پر گفتگو کر رہے ہوتے تو زین دھڑ سے کمرے میں آ جاتی لیکن وہ اسے کبھی یہ نہ کہتے کہ وہ انہیں پریشان نہ کرے اور کمرے سے چلی جائے۔ وہ حاضرین کی موجودگی سے بے نیاز ہو کر بالکل قدرتی انداز میں بڑے حسن و خوبی کے ساتھ اس کا موڈ ٹھیک کرتے اور اسے آرام سے بٹھا دیتے۔ جب وہ مطمئن ہو کر خود اپنی مرضی سے چلی جاتی تو حاضرین سے گفتگو دوبارہ شروع کر دیتے۔ ان کے کردار کا ایک اور اہم پہلو یہ تھا کہ ایک فوجی ڈکٹیٹر ہونے کے باوجود ان میں اپنی انتظامیہ کی غلطیوں اور فروگزاشتوں کو برداشت کرنے اور اپنے ذاتی کردار پر سخت سے سخت تنقید سننے کا بے پناہ حوصلہ تھا۔

وہ بے معنی پرجوش گفتگو حتیٰ کہ بے وقت کی شاعری بھی صبر وسکون سے سنتے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ ایک نیم خواندہ شاعر صدر کی تواضع اپنی آزاد شاعری سے کرنے پر مصر تھے اور انہوں نے خاصی دیر تک کسی ناگواری کا اظہار کئے بغیر شاعر کو اس کا موقعہ فراہم کیا۔ تنقید تو گویا ان کا من بھاتا کھاجا تھا اور بڑی یکسوئی سے اس کے نکات اپنے سامنے ہمیشہ موجود پیڈ پر نوٹ کرتے رہتے لیکن اپنی تمام تر شرافت اور نرم دلی کے ساتھ ساتھ ان کا عزم آہنی تھا اور وہ اصولوں سے سر مو ادھر ادھر نہیں ہوتے تھے۔ جب سپریم کورٹ نے بھٹو کو قتل کی سازش کا مجرم قرار دیا تو دنیا کی کوئی طاقت حتیٰ کہ دنیا کے تقریباً تمام ممالک کے سربراہان کی اپیلیں بھی انہیں اس پر آمادہ نہ کر سکیں کہ وہ عدالت کے فیصلہ میں مداخلت کریں۔ ان کی شخصیت کا نچوڑ یہ تھا کہ ”جو کام کرنا ہے وہ تو کرنا ہی ہے“۔

صدر ضیاء کا دور بھٹو خاندان کی دو حکومتوں کے درمیان تھا۔ انہوں نے عنان حکومت سنبھالی تو ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کا خاتمہ ہوا اور ان کے بعد حکومت مرحوم بھٹو کی صاحبزادی بے نظیر

بھٹو کے حصے میں آئی۔ ان کے اقتدار سنبھالنے سے پہلے کا دور خاصا ہنگامہ خیز تھا۔ اگرچہ صدر ضیاء پر الزام لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے ملک پر فوجی آمریت مسلط کردی، امر واقعہ یہ ہے کہ اگر مرحوم بھٹو جمہوریت کا بری طرح حلیہ نہ بگاڑ دیتے اور ملک کی سالمیت معرض خطر میں نہ پڑ جاتی تو یہ فرض شناس سپاہی کبھی بھی اپنے اختیارات سے تجاوز نہ کرتا (یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان کی فرض شناسی اور اپنے فرائض سے غیر متزلزل وابستگی کی خوبیوں کی بنا پر ہی بھٹو نے ان سے سینئر جرنیلوں پر فوقیت دے کر انہیں فوجی سربراہ کے عہدہ پر فائز کیا تھا)

اپنا فرض نبھانے کا یہ جذبہ ہی تھا جس کی بنا پر انہوں نے قومی اتحاد کی تحریک کے دوران بھٹو حکومت کو مشکلات میں سہارا دینے کی کوشش کی لیکن بالآخر اسی جذبہ کے تحت انہیں ملک کی سالمیت کے دفاع کے لئے دوسرا قدم اٹھانا پڑا۔ بھٹو اور ضیاء کا تنازعہ جمہوریت اور آمریت کی کشمکش نہ تھی۔ اگر بھٹو نے ملک میں سچی جمہوریت کو پروان چڑھایا ہوتا اور ملک میں امن وامان کا دور دورہ ہوتا تو پھر یقیناً ضیاء کے اقدام کو عہد شکنی قرار دیا جاسکتا تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا بھٹو دور واقعی جمہوریت کی نشوونما کا تھا؟ اس سوال کا صحیح جواب حاصل کرنا ضروری ہے کیونکہ بصورت دیگر ضیاء دور کی خوبیاں اور خرابیاں جانچی ہی نہیں جاسکتیں۔ ہمیں تاریخ کے اس باب کا گہرا جائزہ لینا پڑے گا جس میں بھٹو کی طاقت ابھری اور جن وجوہات کی بنا پر ان کے اقتدار کا سورج طلوع ہوا۔ اس باب کا شعور حاصل کئے بغیر اگلا باب...... صدر ضیاء کے دور کا باب...... کیسے سمجھا جاسکتا ہے۔

بھٹو کسی پیمانے سے بھی جمہوری طریقے پر برسر اقتدار نہیں آئے تھے۔

ان کی پارٹی پاکستان پیپلز پارٹی نے 1970ء کے انتخابات میں قومی اسمبلی میں اکثریت حاصل نہیں کی تھی۔ 250 کے ایوان میں ان کی نشستیں صرف 87 تھیں۔ شیخ مجیب الرحمان کی

عوامی لیگ نے اس اسمبلی میں 149 نشستیں جیت کر واضح اکثریت حاصل کی تھی۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اس دور کے صدر جنرل یحیٰی خان، شیخ مجیب الرحمان کو حکومت بنانے کی دعوت دیتے لیکن یہ واضح اور سیدھا جمہوریت کا راستہ اختیار نہیں کیا گیا۔ اس کے برعکس بھٹو نے کھیل بگاڑ دینے والا ''اِدھر ہم اُدھر تم'' کا نعرہ ایجاد کیا۔ جس کا صاف مدعا تھا کہ مغربی پاکستان میں ہماری (یعنی بھٹو کی حکومت) اور مشرقی پاکستان میں مجیب کی حکومت۔ چنانچہ معاملات کی ابتداء میں ہی علیحدگی کا بیج بو دیا گیا۔ بعد ازاں جب قومی اسمبلی کا اجلاس ڈھاکہ میں 8 مارچ کو طلب کیا گیا تو بھٹو نے ان کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا اور مندرجہ بالا نعرہ میں جس نیت کا اظہار کیا گیا تھا، وہ کھل کر سامنے آ گئی۔ بھٹو نے دعویٰ کیا کہ وہ قومی اسمبلی سے اس لئے گریزاں ہیں کہ اس میں مجیب سے اپنی اکثریت کے بل بوتے پر اپنے چھ نکاتی انتخابی منشور کا حامل دستور منظور کرا لینے کا خدشہ تھا، جو ملک کی تباہی کا باعث بن سکتا تھا۔

یہاں دو نکات سمجھ لینا ضروری ہیں۔ پہلا تو یہ کہ ان چھ نکات میں سے جنہیں اب بھٹو ملک کی سالمیت کے لئے خطرہ قرار دے رہے تھے، انہوں نے پہلے ہی ساڑھے پانچ نکات تسلیم کر لئے ہوئے تھے۔ صرف صوبوں کی طرف سے بیرونی تجارت کے حق کے نصف نکتہ پر تنازعہ تھا۔ یعنی اونٹ نگلنے کے بعد بھٹو اب صرف ایک معمولی ٹڈی کو قبول نہ کرنے پر اڑے ہوئے تھے۔ ان حالات میں چھ نکات پر دونوں مدعیان اقتدار کا جھگڑا بے معنی اور بے حقیقت بن چکا تھا۔ دوسرا نکتہ جو قابل غور ہے، وہ یہ ہے کہ اسمبلی کا اجلاس منعقد ہونے کی صورت میں اس بات کا واضح امکان تھا کہ مجیب کا مغربی پاکستان کے ان ممبروں سے، جن کا پیپلز پارٹی سے تعلق نہ تھا، صوبائی خودمختاری پر کوئی معقول سمجھوتہ ہو جاتا جس سے ملک کی سالمیت قائم رہتی۔ بھٹو پر سب سے بڑا الزام ہی یہ ہے کہ انہوں نے اس کی نوبت ہی نہیں آنے دی۔ ان کے بائیکاٹ کی

وجہ سے قومی اسمبلی عملاً معطل ہو کر رہ گئی۔ یہ صریح غلطی تھی کہ مجیب کے خلاف کارروائی کا حکم قومی اسمبلی کا اجلاس منعقد ہونے اور مجیب کی بدنیتی واضح طور پر ثابت ہونے سے قبل دے دیا گیا لیکن بھٹو تو اسمبلی کا اجلاس منعقد ہونے کے تصور ہی کے خلاف تھے۔

وہ اسمبلی کا خاتمہ اس لئے چاہتے تھے کہ مبادا مختلف پارٹیوں میں کوئی سمجھوتہ نہ ہو جائے۔ یہاں ریکارڈ کی خاطر یہ لکھنا ضروری ہے کہ یحیٰی خان کا جرم بھی کچھ کم نہ تھا۔ اگر وہ سازش کا حصہ نہ ہوتے تو اسمبلی کا اجلاس منعقد ہوسکتا تھا۔ اس حوالہ سے اس الزام میں کافی صداقت نظر آتی ہے کہ مغربی پاکستان، مشرقی پاکستان سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ فوجی کارروائی (جس کے آغاز پر بھٹو نے بڑی مسرت سے اعلان کیا کہ خدا کا شکر ہے پاکستان بچالیا گیا ہے) یہ دیکھنے سے پہلے ہی شروع کر دی گئی کہ قومی اسمبلی بحران کے حل کے لئے کیا کرسکتی ہے۔ قومی اسمبلی کی شرکت کو علیحدہ رکھنے سے ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ بھٹو مشرقی پاکستان سے ہر حال میں چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے۔ بصورت دیگر پاکستان تو درکناران کا مغربی پاکستان پر حکمرانی کا خواب بھی شرمندہ تعبیر نہ ہو پاتا۔ جب وہ قوم کے حصے بخرے کر چکے، تبھی بچے کھچے پاکستان پر ان کی حکمرانی قائم ہوسکی اور اس کے لئے بھی کوئی جمہوری طریقہ اختیار نہیں کیا گیا۔ جیسے ہی جرنیلوں نے ان کے اقتدار کی راہ ہموار کی، انہوں نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی خلعت پہن لی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں اعتماد ہی نہ تھا کہ سول انتظامیہ کی صورت میں ان غمزدہ عوام پر قابو پایا جاسکے گا، جنہوں نے بے بسی اور شرمندگی کے عالم میں رسوا کن حالات کا مشاہدہ کیا تھا اور انہیں ملک کو توڑنے کا ذمہ دار سمجھتے تھے۔ 1973ء تک نیا آئین نافذ نہ کیا جاسکا۔ اس درمیانی عرصے میں ان کا دور حکومت کسی طرح بھی جمہوری تو نہیں کہلا سکتا۔

بھٹو کے چھ سالہ دور اقتدار کے آمرانہ مزاج اور انداز کے علاوہ اس کا غیر جمہوری مزاج

1977ء کے انتخابات میں اس وقت بالکل بے نقاب ہو گیا، جب سرکاری سرپرستی میں انتخابات میں وسیع پیانے پر دھاندلی کی گئی۔اس کے نتیجے میں ملک بھر میں ایک تحریک چل نکلی، جس میں کئی جانیں ضائع ہو گئیں۔ بالآخر پیپلز پارٹی کی حکومت نے قومی اتحاد کا نئے انتخابات کا مطالبہ تسلیم کر لیا لیکن اس مقصد کے لئے کسی معاہدہ پر دستخط نہ ہو سکے۔بھٹو کی چال یہ تھی کہ دوسری پارٹی کو مخمصے میں رکھا جائے اور جب معاہدہ تکمیل کے قریب تھا وہ معاملہ کو لٹکتا چھوڑ کر چار مسلم ممالک کے دورے پر روانہ ہو گئے۔ان کے اس بے وقت اقدام سے ظاہر ہوتا تھا کہ مخالفانہ تحریک میں تعطل پیدا کر کے وہ اس وقفہ کو مخالفین پر نئے انداز میں حملہ آور ہونے کے لئے استعمال کرنا چاہتے تھے۔خانہ جنگی کے لئے زمین ہموار ہو چکی تھی۔ یہ وہ نازک مرحلہ تھا، جب باضمیر اور نیک نیت سپاہی ضیاء الحق نے ملک کو تباہی کے راستے سے بچانے کے لئے سامنے آنے کا فیصلہ کیا۔ان کا یہ فیصلہ لمحہ بھر بھی قبل از وقت نہ تھا۔ملک کو توڑنے کے علاوہ بھٹو نے اپنی قومی ملکیت کی بے لگام اور غیر دانش مندانہ پالیسیوں سے ملکی معیشت کو بھی تباہ کر دیا تھا جس کے نتیجہ میں سرمایہ ملک سے باہر جا چکا تھا اور سرمایہ کار راہ فرار اختیار کر رہے تھے۔

انہوں نے ملک میں ایک شخص کی ظالمانہ آمریت مسلط کر دی تھی جس کا نکتہ عروج انتخابات میں دھاندلی کی صورت میں سامنے آیا۔ان کا سب سے بڑا جرم ایک ایسے معاشرے پر ایک لادینی پالیسی کا نفاذ تھا، جس کی بود و باش ہی نہیں نام بھی اسلام سے براہ راست مشتق تھا۔ پاکستان مسلم قومیت کے نام پر معرض وجود میں آیا تھا اور اسلامی طرز زندگی کا نفاذ ہی اس کی علت وجود تھا۔یہی مسلم پاکستان اور ہندو انڈیا میں حقیقی وجہ امتیاز تھا۔اگر پاکستان کو لادینی ریاست ہی بننا تھا تو پھر اسے لادینی ہندوستان سے کس طرح ممتاز کیا جا سکتا تھا۔پھر تو برصغیر کو بانٹ کر اس کا معرض وجود میں آنا ہی بے مقصد تھا۔

بھٹو نے اس نظریاتی سرحد کو ملیا میٹ کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے پہلے مشرقی پاکستان سے اسلامی رشتہ منقطع کیا، جس کے نتیجہ میں اندرا گاندھی کو یہ دعویٰ کرنے کی ہمت ہوئی کہ مسلم لیگ کا دوقومی نظریہ بے بنیاد تھا۔ پھر انہوں نے ایسے نظریات کا پرچار کرنا شروع کر دیا، جس سے پاکستان کی بنیادوں ہی کی نفی ہوتی تھی۔ پیپلز پارٹی کا تثلیثی منشور زندگی کو تین واضح خانوں میں تقسیم کرنے والا تھا۔ معاشی شعبہ سوشلزم کے حوالے کر دیا گیا (پارٹی کی موجودہ چیئر پرسن بیگم نصرت بھٹو نے کھلے بندوں تسلیم کیا ہے کہ سوشلزم نے مارکسزم کی کوکھ سے جنم لیا ہے) سیاست مغربی جمہوریت کے تابع تھی اور مغربی لادینی ریاستوں کے اتباع میں اسلام کو چرچ کی طرح معاملات دنیا سے بالکل الگ کر دیا گیا تھا۔ منشور نہ صرف نظریہ پاکستان کی نفی کرتا

یہ محسوس کرلیا کہ بھٹو کا وجود ملک کی سالمیت کے لئے ایک خطرہ ہے۔ وہ نہ صرف جمہوری، سیاسی طرزعمل اور صحت مند معیشت کے لئے نقصان کا باعث تھے بلکہ خود ملک کے استحکام کو منہدم کرنے کا سبب بھی بن سکتے تھے۔ جب جنرل ضیاء الحق نے ایک انتہائی پیچیدہ سیاسی اور نظریاتی صورت حالات کو سنبھالنے کا قدم اٹھایا تو ملک خانہ جنگی کی دہلیز پر کھڑا تھا۔

ایک وحدانی فوجی حکومت میں نظم ونسق اور امن وامان بحال کرنا کوئی بڑا مسئلہ نہ تھا۔ اصل مسئلہ تو ملک کی نظریاتی شناخت کو بحال کرنا اور معیشت کو حیات نو بخشنا تھا۔ کیونکہ پہلے دور میں ان کی حالت از حد خراب کر دی گئی تھی۔ پھر بیرون ملک بہت سے ممالک سے تعلقات کی کشیدگی بھی ایک اہم مسئلہ تھی۔ ان ممالک میں امریکہ جیسے روایتی دوست بھی شامل تھے۔ صدر ضیاء نے ان تمام چیلنجوں کا سامنا اپنے روایتی عزم اور سکون سے کیا۔ بہت جلد معیشت کے شعبے میں وہ اعتماد بحال ہوگیا جو بے لگام قومی ملکیت کی پالیسی نے برباد کر دیا تھا۔ بیرون ملک تعلقات کی بحالی میں بھی انہیں غیر معمولی کامیابی نصیب ہوئی لیکن انہیں اسلامی اقدار کو عملی جامہ پہنا کر انہیں معاشرہ میں ترویج دینے کی سب سے زیادہ فکر تھی۔ اس کی ابتداء انہوں نے ملک بھر میں نماز کے قیام کے لئے صلوٰۃ کمیٹیاں تشکیل کر کے کی۔ پھر انہوں نے نظام زکوٰۃ کا احیاء کیا اور پھر حدود اسلامی نافذ کیں۔ انہوں نے ذرائع ابلاغ کے ذریعے اسلامی معاشرہ کا مزاج پیدا کرنے کی کوشش کی۔ بہت جلد ریڈیو سے اذان اور درس قرآن کا سلسلہ شروع ہوگیا اور معاشرے کے نظریاتی افق پر تبدیلی کے گہرے اثرات رونما ہونے لگے۔ اسلامی نظریاتی کونسل کے سامنے نئے ہدف متعین کئے گئے اور اس سلسلے میں کونسل نے نہایت قابل قدر کارنامے سرانجام دیئے۔ وہ آخری کام یہ کرنا چاہتے تھے کہ ہر مدرسہ فکر کے علماء سے مشورہ کر کے اسلامی قوانین کے نفاذ کے لئے ایک آرڈیننس نافذ کر دیں۔

تاریخ میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ ایک شخصیت کی متعدد خوبیاں اور کارنامے اس کے لئے باعث فخر ہوتے ہیں لیکن کوئی ایک غیر معمولی کارنامہ تاریخ میں اس کا نام انمٹ اور غیر فانی بنا دیتا ہے۔ مثال کے طور پر قائداعظم کی ہمہ پہلو شخصیت کئی زاویوں سے عظمت کی سزاوار تھی۔ وہ ایک قابل وکیل تھے، ممتاز سیاست دان تھے، اسلامی قانون کا معتبر حوالہ تھے اور ایک نہایت فیاض انسان دوست شخصیت۔ لیکن تاریخ نے انہیں جس عظیم مقام پر فائز کیا، وہ ان کے سب سے بڑے کارنامے تخلیق پاکستان کے سبب تھا۔ ان کے بارے میں سب کچھ بھلایا جا سکتا ہے لیکن انہیں بابائے پاکستان اور خالق پاکستان کی حیثیت سے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح صدر ضیاء الحق کا نام حالیہ تاریخ کے ایک نہایت مہتمم بالشان دور سے اس طرح وابستہ ہو گیا ہے کہ ان کی شخصیت کے دیگر پہلو بالکل ماند پڑ گئے ہیں۔ یوں تو ان کے بارے میں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر، اسلامی مصلح، شوریٰ کے انداز کی مقننہ کے موجد غیر معمولی صلاحیتوں والے دفاعی ماہر اور ایک ایسے ڈکٹیٹر کی حیثیت سے جس نے رضا کارانہ اقتدار عوام کی منتخب اسمبلی کو سونپ دیا۔ بہت کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن جس واحد واقعہ نے انہیں دنیا کے صف اول کے رہنماؤں میں شامل کر دیا، وہ افغانستان پر روسی جارحیت تھی۔ انہیں افغانستان کے محافظ اور آزادی دلانے والے کے طور پر ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

افغانستان کے حوالے سے جنوبی ایشیاء کے اس انقلاب کو برپا کرنے میں ان کے کردار کی قدر و منزلت کا صحیح اندازہ لگانا ابھی باقی ہے لیکن یہاں الجیریا کے عظیم قائدین بن بیلا کا یہ قول نقل کرنا مناسب ہوگا جس میں انہوں نے ضیاء الحق کو چرچل سے بھی بڑے درجے اور مقام کا حامل قرار دیا کیونکہ ان کی رائے میں چرچل کو امریکہ کی غیر متزلزل اور بھرپور اخلاقی اور مالی مدد حاصل تھی لیکن صدر ضیاء نے خود اپنے بل بوتے پر روسی استعمار کو پسپا کر دیا۔ افغانستان جیسے

چھوٹے اور پسماندہ ملک سے جس کی سرحدیں بھی ویت نام کے برعکس روس سے ملحق تھیں، روسی فوجوں کا انخلاء کوئی معمولی کارنامہ نہ تھا۔ افغانستان کی آزادی کا مقابلہ ہمارے عہد کے نمایاں ترین واقعات سے کیا جا سکتا ہے۔ قیام پاکستان کے ساتھ ساتھ یہی وہ اہم تبدیلی ہے، جس نے اسلام کے ایک زریں اور باجبروت مستقبل کی نشاندھی کی۔

دسمبر 1979ء کے اواخر میں جب سوویت یونین نے افغانستان پر حملہ کیا تو صدر ضیاء کی دوربین اور تیز نظروں نے اس کے دور رس نتائج وعواقب کو فوراً بھانپ لیا۔ انہوں نے اندازہ لگایا کہ جنوب کی طرف پیش قدمی کی روایتی سوچ کے مطابق روس کے قدم ابھی اس حد تک نہیں بڑھے کہ اس کے دفاعی طور پر نازک علاقے محفوظ ہو گئے ہوں۔ انہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ اسی مقصد کے حصول کے لئے ماسکو کے حکمران مزید پیش قدمی کریں گے تاکہ دفاعی سوچ کے تقاضے پورے ہو سکیں۔ اس بنا پر ان کی افغانستان پر جارحیت بجا طور پر ان کے پاکستان پر غلبہ کی مدتوں پرانی آرزو کی تکمیل کا پیش خیمہ ہے۔ اس کے بعد روس کے بحیرہ عرب کے گرم پانیوں تک رسائی کے خواب کی تکمیل ہو سکتی تھی۔ صدر ضیاء نے افغانستان پر روسی قبضہ کو صحیح تناظر میں دیکھا اور بلا تاخیر یہ اعلان کیا کہ افغان مجاہدین پاکستان کے تحفظ کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ اس لئے وہ پاکستان کی حکومت اور عوام کی غیر مشروط حمایت اور مدد کے حقدار ہیں۔

افغان مجاہدین جنہوں نے کابل کی پختونستان کے نعرے سے متاثر فضا میں پہلی مرتبہ اسلام کا نعرہ بلند کیا تھا، اپنے کام کی ابتدا سردار داؤد خان کے دور میں ہی کر چکے تھے۔ سردار داؤد خان کی ہی روس کے لئے پسندیدگی کی پالیسیوں کے نتیجہ میں نام نہاد ثور یا کمیونسٹ انقلاب کی راہ ہموار ہوئی تھی۔ روس کے تربیت یافتہ افسروں کی رضا مندی اور مدد سے ہی خلق اور پرچم پارٹیوں نے افغانستان پر ترہ کئی اور حفیظ اللہ امین کو مسلط کیا جس کے بعد ببرک کارمل روسی

ٹینک پر سوار منظر عام پر آیا۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ ہر محبّ وطن شہری اس روسی حملہ کے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا لیکن ایسا نہ ہوا تو یہ پروپیگنڈہ سچ لگنے لگا کہ برپا ہوتا انقلاب افغانستان کے عوام کی سچی حمایت سے برپا ہوا تھا۔ حالانکہ اس انقلاب میں اگر کچھ حقیقت تھی تو بس اتنی کہ خلق اور پرچم پارٹیوں نے کمیونزم کو اس معاشرہ میں جس کے دل ونگاہ میں اسلام رچا بسا تھا، ایک چمک عطا کردی تھی۔ امر واقعہ یہ تھا کہ روس کی جارحیت دین اسلام کے لئے ایک براہ راست نظریاتی چیلنج تھا۔ انقلاب کے مسلح روسی معاون اسلام کو جڑ سے اکھاڑ کر اس کی جگہ کمیونزم کا پودا کاشت کرنا چاہتے تھے۔ اس انقلاب میں مضمر یہ خطرہ صرف ان لوگوں کو محسوس ہوسکتا تھا، جن کے جذبات اسلام کے بارے میں حساس تھے اور جو اسلام کے لئے خطرہ کا شعور رکھتے تھے۔ نیز اسلام کی راہ میں اپنی جانیں قربان کرنے کے جذبے سے سرشار تھے۔

افغان جہاد میں جن گروہوں نے حصہ لیا، وہ اپنی اندرونی تنظیم اور انداز کار میں اختلافات کے باوصف اپنے مقاصد، مزاج اور نفسیات کے اعتبار سے خالص اسلام کے پیروکار تھے۔ افغانستان کے حالات کے اس رخ نے صدر ضیاء کو از حد متاثر کیا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ بالآخر خان عبدالغفار خان کی پاکستان دشمن تحریک کے نتیجے میں اٹھنے والی پختونستان کی تنگ نظر اور لادینی جدوجہد کے غبارے سے ہوا نکالنے کے لئے ایک اسلامی تحریک اٹھ کھڑی ہوئی ہے۔

صدر ضیاء نے یکسو ہو کر اپنے آپ کو افغانستان کو سوویت یونین کے پنجے سے نجات دلانے کی جدوجہد کے لئے وقف کردیا۔ وہ اس جدوجہد کے لئے گراں سے گراں قیمت ادا کرنے پر تیار تھے۔ افغان پناہ گزینوں کی روز افزوں تعداد کو پناہ دی گئی۔ تیس لاکھ سے زیادہ افراد کی خوراک اور قیام کا انتظام کیا گیا۔ پاکستان کی وزارت خارجہ کو ہدایت کی گئی کہ وہ اپنی پوری توجہ صرف افغان مسئلہ کے حل پر مرکوز کردے۔ بعد ازاں دوسرے مغربی ممالک نے

افغانستان کے مسئلہ میں دلچسپی لینا شروع کر دی لیکن ابتدائی دو سالوں میں پاکستان تن تنہا افغان جہاد کی پشت پر ڈٹا ہوا تھا۔ اس کشمکش کے آغاز میں امریکہ کے صدر کارٹر نے اپنے سیکورٹی ایڈوائزر برزنسکی کو نا قابل اعتنا مدد کی پیشکش کے ساتھ پاکستان بھیجا لیکن وہ اتنی حقیر تھی کہ صدر ضیاء نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اسے طنزاً انگریزی محاورے کے مطابق Peanut قرار دیا۔ (یاد رہے کہ صدر کارٹر نجی طور پر مونگ پھلی Peanut کے کاشت کار تھے) ریگن کی انتظامیہ کے اقتدار سنبھالنے کے بعد ہی یہ احساس اجاگر ہوا کہ مجاہدین ڈیڑھ لاکھ روسی افواج کے خلاف برسرپیکار ہیں۔ اب کہیں جا کر انہیں مستحکم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور مدد آنی شروع ہوئی۔ مجاہدین نے بہت تیزی سے جدید ہتھیاروں کے استعمال میں مہارت حاصل کر لی اور بہت جلد افغانستان کی فضا کو سوویت گن شپ ہیلی کاپٹروں سے سٹنگر میزائل استعمال کر کے پاک کر دیا گیا۔

سوویت یونین میں گورباچوف کے منظر عام پر آنے کے بعد کریملن میں افغانستان کی مہم کے بارے میں حقیقت واضح ہونے لگی۔ گورباچوف نے اسے ایک رستا ہوا ناسور قرار دیا۔ اسے حالات کی سنگینی کا احساس تو ہو گیا لیکن اس نے فوراً پالیسی میں نرمی پیدا نہ کی۔ اس کے برعکس اس نے ایک طرف تو روسی جرنیلوں کو پورے ساز و سامان سے مسلح کر کے معاملہ کو جلد انجام تک پہنچانے کے لئے پوری ڈھیل دی تو دوسری طرف نجیب اللہ کو حکم دیا کہ مجاہدین کی طرف صلح صفائی کا ہاتھ بڑھائے۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ دونوں تدبیریں بے نتیجہ ثابت ہوئیں۔ اب یہی کافی نہ تھا کہ روس کی افغان پالیسی کے بارے میں اپنے ہی کارناموں کی مذمت میں بیانات دیئے جائیں (مثلاً ایک مرتبہ اس حملہ کو ایک ''جرم'' قرار دیا گیا) اور دوسری طرف جنگ بھی جاری رکھی جائے۔ گورباچوف نے رفتہ رفتہ اس مہم کے خاتمہ کی طرف پیش قدمی شروع کر

دی لیکن وہ چاہتا تھا کہ اس سلسلے میں امریکہ سے کوئی سودے بازی کر کے بدلے میں کچھ حاصل کر سکے۔ امریکی حکومت اس سلسلے میں روس سے معاملہ کرنے کے لئے تیار تھی۔ بشرطیکہ روس افغانستان سے اپنی فوجیں واپس بلالے۔ اس طرح امریکہ خلیج کے تیل سے مالا مال علاقے کے قریب روسی افواج کی موجودگی کے دردسر سے نجات پا سکتا تھا۔ چنانچہ سودا یہ طے پایا کہ روس اپنی افواج افغانستان سے نکال لے گا اور اس کے معاوضے میں امریکہ افغانستان میں مجاہدین کی اسلامی حکومت کے قیام کی راہ میں روڑے اٹکائے گا۔

سوویت یونین افغانستان میں ایک اسلامی حکومت کا قیام اس لئے گوارا نہ کر سکتا تھا کہ اس طرح بے پناہ قوت کے استعمال کے باوجود اس سرزمین میں کمیونسٹ افکار کی تخم ریزی میں اس کی ناکامی کھل کر سامنے آجاتی۔ دوسری طرف امریکہ بھی ایران کے تلخ تجربے کے بعد ایک اور بنیاد پرست اسلامی حکومت کے معرض وجود میں آنے کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہ کر سکتا تھا۔ اس طرح دونوں بڑی طاقتوں کی اسلام دشمنی نے ان کے درمیان ایک مفاہمت پیدا کر دی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سوویت یونین کے اپنی افواج کی واپسی کے یک طرفہ اعلان کے ایک سال کے اندر اندر جنیوا مذاکرات کی طرح ڈال دی گئی۔ ان مذاکرات نے جنیوا معاہدہ کو جنم دیا اور اس کے تحت افغانستان اور پاکستان نے ایک دوسرے کے معاملات میں مداخلت نہ کرنے کی یقین دہانی کرادی اور سوویت یونین اور امریکہ نے اس کی ضمانت فراہم کر دی۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ اس معاہدہ کے نتیجہ میں نہ تو جنگ اپنے اختتام کو پہنچی اور نہ ہی نجیب کی کٹھ پتلی حکومت کو ختم کر کے ایک عارضی حکومت کا قیام عمل میں آیا۔

سچی بات یہ ہے کہ جس حکومت کو روسیوں نے افغانستان پر مسلط کیا تھا، اس کے خاتمے کے بغیر روسی فوجوں کا انخلا ایک بے معنی بات تھی۔ یہ حقیقی معنوں میں انخلا نہ تھا۔ چنانچہ افغانستان

میں خونریزی جاری رہی۔ایسا کیوں ہوا؟اس کی پہلی وجہ تو یہ تھی کہ افغان مجاہدین جنیوا معاہدہ میں شریک نہ تھے۔روسیوں نے ان سے براہ راست بات کرنے سے انکار کر دیا تھا۔اگرچہ مجاہدین نے متعدد مرتبہ اس پر رضامندی کا اظہار کیا۔آخر کار وہ اس جنگ میں برابر کے شریک تھے۔اب وہ ایک ایسے معاہدے پر کیسے عمل کر سکتے تھے جس کی تکمیل میں وہ شریک ہی نہیں تھے۔نجیب حکومت کو برداشت کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔یہی حکومت تو تھی جس کے ہاتھ پندرہ لاکھ افغانوں کے خون سے آلودہ تھے اور جس نے ملک کو تہس نہس کر دیا تھا۔دوسری وجہ روس اور امریکہ کی ملی بھگت تھی جس کے تحت وہ مجاہدین کی اسلامی حکومت کے قیام کو اپنے مفاد کے خلاف سمجھتے تھے اور اس کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرنا چاہتے تھے۔

ایک تیسری وجہ پاکستان کی اندرونی صورت حالات سے متعلق تھی اور وہ جونیجو حکومت کی یہ آرزو تھی کہ مجاہدین کی حکومت کے قیام کے بارے میں روس اور امریکہ کے رویہ میں نرمی پیدا کی جائے۔محمد خان جونیجو کو صدر ضیاء الحق نے 1985ء کی منتخب اسمبلی کے 250 عام ممبروں میں سے خصوصی طور پر چنا تھا۔اس کے بعد صدر ضیاء نے ڈکٹیٹروں کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔انہوں نے عملاً پورے طمطراق کے ساتھ ملک کے منتظم اعلیٰ کے اختیارات اپنے نامزد کردہ وزیر اعظم کے حوالے کر دیئے (یہ تقریب ٹی وی پر پوری قوم کو دکھائی گئی) بدقسمتی سے جونیجو اس تاریخی اقدام کی اہمیت کو صحیح معنوں میں نہ سمجھ سکے۔نہ تو بحیثیت ایک ممنون احسان شخص کے طور پر جسے اس شخصیت کا شکر گزار ہونا چاہیے تھا،جس نے انہیں ایک نسبتاً غیر معروف مقام سے ملک کے اعلیٰ ترین منصب پر پہنچا دیا تھا اور نہ ایک سمجھدار سیاست دان اور اچھے منتظم کے طور پر جسے اس ہستی کے مشوروں سے فائدہ اٹھانا چاہیے تھا جسے معاملات کا زیادہ تجربہ تھا۔خارجہ معاملات کو حکمت عملی سے چلانے کے معاملے میں تو ان کی کارکردگی اور بھی مایوس کن

ثابت ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ آٹھویں ترمیم کے نتیجے میں صدر انتظامیہ کی طاقتور ترین شخصیت بن گئے تھے۔ اس کی حقیقت تو اسی بات سے کھل جاتی ہے کہ 1987ء کا بجٹ دستور کے تقاضوں کے مطابق نہ تو ان کے سامنے پیش کیا گیا اور نہ ہی ان کی منظوری کے لئے ان کے دستخط حاصل کئے گئے۔ اس پر طرہ یہ کہ ان کے نامزد کردہ وزیر خارجہ صاحبزادہ یعقوب خان کو کسی رسمی کارروائی کے بغیر فارغ کر دیا گیا اور اس سلسلے میں اس بات کو پرکاہ کے برابر وقعت نہ دی گئی کہ اس سلسلے میں صدر ریاست کا ردعمل کیا ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ جونیجو بے پناہ اختیارات اور قوت کے حامل بن گئے۔ صدر تو تقریباً بے بس ہو کر رہ گئے تھے۔ پھر بھی انہیں آمرانہ اختیارات استعمال کرنے کا مجرم ٹھہرایا جاتا رہا۔

دوسری طرف جونیجو بے پناہ اختیارات کے حامل تو تھے لیکن ناقابل علاج احساس کمتری کا شکار بھی تھے۔ جہاں تک صدر ضیاء کا تعلق تھا انہوں نے گزشتہ برسوں میں اپنی گفتگو اور تقاریر کے ذریعے لوگوں کے دلوں کو مسخر کرنے کا فن سیکھ لیا تھا۔ وہ فصاحت اور بلاغت سے عاری روزمرہ کی سیدھی سادی زبان میں بات کرتے تھے لیکن ان کے ارشادات ان کی اسلام سے گہری وابستگی کے مظہر ہوتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ایک ایسا طرز خطاب ایجاد کیا تھا جو لوگوں کو مبہوت کر دیتا تھا۔ دستور کے تحت ان کے اختیارات میں کمی ہو گئی تھی لیکن ان کی مسحور کن خطابت نے اس کی ساری کسر پوری کر دی کیونکہ وہ جب بھی موقعہ ملتا قوم سے خطاب کرتے رہتے تھے۔ جب بھی کسی قومی تقریب کے موقعہ پر وہ اپنی لکھی ہوئی تقریر سے ہٹ کر فی البدیہہ کچھ فرماتے تو عوام میں ایک انوکھے احساس کی لہر دوڑا دیتے۔ چونکہ وہ جو کچھ کہتے، وہ ان کے دل کی آواز ہوتی اور زمینی حقائق سے اس کا ایک غیر مرئی رابطہ ہوتا عوام ان کی آواز پر آمنا و صدقنا کہتے۔ ان کی حقیقت پسندانہ خطابت کانوں کے لئے اتنی دلکش ہوتی کہ لوگ ان کی اگلی

تقریر کا بے تابی سے انتظار کرتے۔ ان کی موجودگی کا احساس ان کے بلند منصب کی وجہ نہیں ہوتا تھا بلکہ ان کی شخصیت کی سادگی نے انہیں ایک اپنی نوعیت کا وزن عطا کر دیا تھا۔

وہ ایک قائد کی حیثیت سے اپنی جداگانہ بلکہ یکتا شخصیت کے حامل تھے۔ ان کا پیکر جس مٹی سے بنا تھا، وہ پاکستان میں کم پائی جاتی ہے۔ وہ وقت کے ساتھ ساتھ ایک عوامی قائد کے طور پر ابھرے اور اپنی صفات اور خصوصیات کی بنا پر اپنا لوہا منوایا۔ جونیجو کے لئے، جو اپنی راہ گم کر چکے تھے، وہ بہت بھاری بھر کم ثابت ہوئے۔ چنانچہ ان کے ذہن میں اپنے محسن کے خلاف ایک رنجش پروان چڑھنے لگی جس میں ان کے حالی موالی اضافہ کرنے کا باعث بنتے رہے۔

اپنی ذات کی اہمیت جتانے کے لئے جونیجو نے صاحبزادہ یعقوب خان کو وزیر خارجہ کے منصب سے علیحدہ کرنے کا انتہائی اقدام کر ڈالا اور یہ قلمدان خود سنبھال لیا۔ اس تبدیلی کا بعد میں المناک نتیجہ نکلا۔ جلد ہی ان کا پہلا امتحان اس وقت ہوا جب گورباچوف نے روسی فوجوں کی افغانستان سے یک طرفہ واپسی کا اعلان کر دیا۔ دنیا میں یہ ڈھنڈورا پیٹا گیا کہ یہ قدم روس کی امن پسندی کی علامت تھا لیکن یہ حقیقت واشگاف تھی کہ یہ روس کی طرف سے مجاہدین کے ہاتھوں ہزیمت کا کھلا اعتراف تھا۔ ضیاء الحق کو نہ تو اس پر تعجب ہوا اور نہ ہی وہ اس سلسلے میں کسی فریب کا شکار ہوئے۔ ان کو اصل صورت حال کا بخوبی علم تھا۔ وہ صرف اس کی سرکاری تصدیق کا انتظار کر رہے تھے اور اگلے اقدام کا پلان بنا رہے تھے جس کے تحت افغانستان میں مجاہدین کی عارضی حکومت کے قیام پر زور دیا جا سکے۔ اس طرح کی اسلامی حکومت افغانستان اور پاکستان میں باہمی تعلقات کو فروغ دینے کا سبب بنتی۔ صدر ضیاء کی نظریں مستقبل میں دور تک دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے وزیراعظم جونیجو کو مشورہ دیا کہ وہ گورباچوف کے اعلان کو غیر معمولی اہمیت نہ دیں اور اسے روزمرہ کی کارروائی سمجھیں۔

ان کی رائے تھی کہ روشنی کی ایک کرن تو دکھائی دی ہے لیکن منزل ابھی بہت دور ہے۔ روسی فوجوں کی واپسی کا اعلان اہمیت تو رکھتا تھا لیکن یہ آخری حل کی طرف محض ایک قدم تھا۔ اصل حل تو یہ تھا کہ اقتدار اس کے اصل وارثوں یعنی مجاہدین کے حوالے کیا جائے۔ انہوں نے جونیجو کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ جلد بازی میں جنیوا معاہدہ پر دستخط نہ کریں بلکہ اسے افغانستان میں عارضی حکومت کے قیام کے ساتھ مشروط کر دیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس مقصد کا حصول کا یہ آخری موقع ہے اور حالات سے فائدہ اٹھا کر اسے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اس کے حصول کی راہ کی بھی نشاندھی کر دی جو یہ تھی کہ امریکیوں سے روسیوں پر اس سمت پیش قدمی کے لئے دباؤ ڈلوایا جائے۔ صدر ضیاء کو اس طریق کار کی کامیابی کا یقین دو حقائق پر مبنی تھا۔ ایک تو یہ کہ امریکی رائے عامہ پاکستان اور مجاہدین کے حق میں تھی، جس کی تصدیق اس ضمن میں امریکی سینٹ کی متفقہ قرارداد سے ہوتا تھا۔ ثانیاً روس پوری طرح امریکہ کے دباؤ میں تھا۔ کیونکہ گورباچوف کی برپا کردہ سماجی اور معاشی اصلاحات کی کامیابی کا انحصار امریکہ کی رضا اور اس کے ساتھ خوشگوار تعلقات پر تھا۔ ضرورت صرف اس بات کی تھی کہ کسی طرح وقت گزارا جائے اور اپنے موقف پر سختی سے ڈٹا جائے تا کہ کسی ہڑبونگ میں ایک خالی خولی قبل از وقت معاہدہ پر دستخط نہ کر دیئے جائیں۔

دوسری طرف جونیجو بے چین تھے کہ کسی نہ کسی طرح عالمی منظر پر ان کی شخصیت کا نقش ابھرے اور وہ اپنے سینے پر ایک تمغہ سجا سکیں۔ یہ تو بین الاقوامی طور پر اپنی حیثیت منوانے کا ایک نادر موقع تھا جو شاید پھر ہاتھ نہ آتا۔ اس سے پہلے وہ یہ کھوکھلا اعلان کر چکے تھے کہ انہوں نے مارشل لاء اٹھالیا ہے حالانکہ یہ عام عقل سلیم کی بات تھی کہ مارشل لاء تو وہی اٹھا سکتا تھا، جس نے اسے نافذ کیا تھا۔ اب وہ یہ امتیاز حاصل کرنے پر تلے ہوئے تھے کہ ان کی وجہ سے ایک بین

الاقوامی تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ اپنے اقدامات کو عوامی حمایت کا نقاب اوڑھانے کے لئے انہوں نے دوطرفہ حکمت عملی تشکیل دی۔ ایک طرف تو انہوں نے قومی اسمبلی کا اجلاس طلب کرلیا تاکہ عوامی نمائندوں کے ساتھ مسئلہ پر بحث وتمحیص کا بہروپ بھرا جائے۔ دوسری طرف انہوں نے سیاسی جماعتوں کی ایک گول میز کانفرنس طلب کرلی تاکہ اپوزیشن کو بھی اعتماد میں لیا جاسکے۔ ان دونوں ضیاء مخالف پلیٹ فارموں سے بظاہر جمہوریت کی خدمت کی گئی لیکن قومی مفاد کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا گیا۔ قومی اسمبلی کی مکمل تائید حاصل کرنے کے لئے ہر رکن اسمبلی کو 50,50 لاکھ کے ترقیاتی فنڈ دیئے گئے اور ایک مسلم لیگ اسمبلی پارٹی تشکیل دی گئی جسے قانونی طور پر حکومت کے خلاف ووٹ دینے کی ممانعت کردی گئی۔ ان دونوں پلیٹ فارموں نے بلاکسی جھجک سوویت یونین سے عارضی حکومت کے قیام کی پیشگی یقین دہانی کے بغیر جنیوا معاہدہ پر دستخط کرنے کی سفارش کردی۔ حالانکہ سارے مسئلہ کا حل اسی میں مضمر تھا۔ چنانچہ ایک حقیقت پسند صاحب نظر ہستی کے پروگرام کو ایک کوتاہ بین سازشی نے تلپٹ کردیا۔ ایک ایسا تاریخ ساز لمحہ ضائع کردیا گیا جو وقت کے دھارے کو موڑ سکتا تھا۔ اس کے برعکس ہوا یہ کہ روس اور امریکہ، منفی اور مثبت سمٹری پر متفق ہوگئے، جس کا تعلق اپنے اپنے افغان اتحادیوں کو اسلحہ کی فراہمی سے تھا لیکن جس کا واسطہ نہ تو جنگ کے خاتمہ سے تھا اور نہ کابل میں عارضی حکومت کے قیام سے۔

یہ وہ سانحہ تھا، جس نے صدر ضیاء کی روح کو مجروح کردیا۔ ان کا عظیم تاریخی کارنامہ خاک میں ملا دیا گیا۔ وہ یقیناً یہ سوچنے پر مجبور ہوگئے ہوں گے کہ افغانستان کے حوالے سے انہوں نے انتقال اقتدار میں بہت جلدی کی۔ اس نازک مرحلہ پر عنان کار خود ان کے اپنے ہاتھوں میں ہوتی تو اس اندوہناک سانحہ سے بچا جاسکتا تھا۔ چنانچہ جس کا ڈر تھا، وہی ہوا۔ افغانستان میں خونریزی جاری رہی اور سوویت یونین کو اپنی سیاسی اور فوجی کاوشوں کو ازسرنو استوار کرنے کے

لئے قیمتی موقع ہاتھ آ گیا۔ مجاہدین اور پاکستان کی کاوشوں کے اس ضیاع پر صدر ضیاء الحق اپنے روایتی عزم بالجزم سے کام لینے پر مجبور ہو گئے اور انہوں نے جونیجو حکومت اور اسمبلیوں کو برطرف کر دیا۔ اب ان کی اولین ترجیح یہ تھی کہ جونیجو حکومت نے حالات کا جس طرح ستیاناس مارا تھا، اس کے اثرات بد کو روکا جائے اور فیصلہ کن مرحلہ آنے سے پہلے جہاد کی کوششوں میں نئی روح پھونک دی جائے۔

ان کی خواہش تھی کہ علاقے میں بھارت کی ریشہ دوانیوں کے خطرناک حد تک بڑھ جانے سے پہلے افغانستان اور پاکستان اتحاد کی اسلامی لڑی میں پرو دیئے جائیں اور معاملات کو ایک واضح انجام تک پہنچا دیا جائے۔ افسوس ایسا نہ ہو سکا۔ صدر ضیاء کے عزائم روس، امریکہ اور بھارت کی مشترکہ حکمت عملی سے براہ راست متصادم تھے۔ ان طاقتوں کو خدشہ تھا کہ اگر صدر ضیاء کو اپنے پروگرام پر عمل کرنے کا کھلا موقع مل گیا تو شاید وہ بہت دور تک چلے جائیں اور روس کے دفاعی نکتہ نظر سے حساس علاقوں کے بالکل ساتھ ایک اسلامی حکومت کے قیام میں کامیاب ہو جائیں جو ان کے لئے مستقل خطرے کا باعث بنی رہے۔

اسی بنیاد پر ایک اسلامی بلاک تشکیل پانے کا خدشہ بھی لاحق تھا، جو ان کے عزائم کو خاک میں ملا سکتا تھا۔ اب جب صدر ضیاء جدوجہد کے آخری مرحلے کے لئے تیاری کر رہے تھے، انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ صدر ضیاء کی ان ہی تاریخی خدمات کے اعتراف میں افغان مجاہدین نے بجا طور پر ان کے مزار پر ''شہید جہاد افغانستان'' کا کتبہ نصب کیا۔

صدر ضیاء ایک بھرپور زندگی گزارتے ہوئے شہید کر دیئے گئے اور افغانستان کے سلسلے میں ان کا مشن پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ لیکن وقت کی رہگزر پر ان کے جو نقوش پا ثبت ہیں، امتدادِ زمانہ

سے مٹ نہ پائیں گے۔ انہوں نے جس جدوجہد کی ابتداء کی، وہ جاری رہے گی۔ افغان جہاد کی روح اوراس کا جذبہ انمٹ ہے۔ یہ تحریک لادینی رکاوٹوں کو خاطر میں لانے والی نہیں خواہ وہ اندرونی ریشہ دوانیوں سے ابھریں یاان کی پشت پر خارجی طاقتیں ہوں۔ روس کی سازشیں اور دھمکیاں بھی اس پر اثر انداز نہیں ہوسکتیں۔ اگرچہ اس دور کی حکومت کی پالیسیوں نے ان کے لئے خاصی گنجائش پیدا کردی ہے۔ (مثال کے طور پر مجاہدین کی عارضی حکومت کو تسلیم نہ کرنا) یہ سانحہ واقعات کے ایک نئے سلسلے کو جنم دے گا، جس کے نتیجہ میں صدر ضیاء کا نام تاریخ میں زندہ جاوید ہو جائے گا۔

میں نے اس مضمون کی ابتدا میں یہ تذکرہ کیا تھا کہ صدر ضیاء کے جنازے میں پاکستان کے دور دراز اور پسماندہ علاقوں سے بھی ایک ہجوم نے شرکت کی تھی۔ یہ لوگ جو ایسی بستیوں کے مکین تھے، جن کی طرف توجہ کم ہی دی جاتی ہے، شہروں کے سفید پوش طبقوں کی نظروں سے اوجھل رہے ہوں گے لیکن صدر ضیاء کی نظروں میں ان کی اہمیت کبھی کم نہیں رہی تھی۔ اس لئے ان کا اثر اور مقبولیت جوان کی اسلام سے وابستگی کا مظہر تھی، ان دور دراز علاقوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ چنانچہ ان کی آخری رسومات کے موقعہ پر یہ لوگ پہلی مرتبہ قومی افق پر ابھرے۔ ان کی موجودگی جہاں شہید ضیاء الحق کے نفوذ واثر کی شہادت تھی، وہاں اس بات کی دلیل بھی تھی کہ یہ منظر سے غائب ہونے والے نہیں بلکہ شہید کی زندگی مقاصد اور آرزوؤں کی تکمیل کے لئے سرگرم رہیں گے۔ وہ ایسی لہروں کی مانند نظر آتے ہیں، جن کی گہرائی، گیرائی اور ہمہ گیری روزانہ بڑھتی رہے گی اور وہ سیاسی پلیٹ فارموں پر چھا کر انہیں اپنی لپیٹ میں لیتی رہیں گی۔

تاریخ کی اس کروٹ کو مخالفین نے "ضیاء ازم" کا نام دیا ہے اور یہی ان کی نیندیں اڑا دینے والا عنصر ہے۔ شہید ضیاء زندہ ضیاء سے زیادہ پر اثر اور طاقتور ثابت ہو رہے ہیں۔ ان سب نے

سر جوڑ کر اس کا توڑ سوچنے کی کوشش کی تاکہ ان کے مشن اور مقاصد کی لہر کو روکا جا سکے۔ ہائی کورٹ سے درخواست کی گئی کہ وہ اسمبلیوں کی تحلیل کے قانونی یا غیر قانونی ہونے کا فیصلہ کریں۔ اس فیصلے میں تاخیر نہ ہوئی کیونکہ جس حکومت کو دفاع کرنا تھا، وہ کوئی معقول دفاع پیش نہ کر سکی۔ چنانچہ دفاع کی طرف سے مناسب پیروی نہ ہونے کے باعث ہائی کورٹ کو تقریباً یک طرفہ فیصلہ کرنا پڑا اور یہ اقدام ناجائز قرار دے دیا گیا۔ اس کی تصدیق ان ہی وجوہات کی بنا پر سپریم کورٹ سے بھی فوری طور پر ہو گئی۔ منطقی طور پر تو اس فیصلہ کے نتیجہ میں کالعدم اسمبلیاں بحال ہو جانی چاہئیں تھیں تاکہ اپنے ارکان میں نئے یا پرانے حکمران چن سکیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ صدر ضیاء کی تخلیق کردہ اسمبلیاں 1990ء تک کارفرما رہتیں۔ شاید یہ بات ان لوگوں کو پسند نہ ہوتی جو برسر اقتدار تھے۔ عدالت نے یہ طے کیا کہ مردوں کو زندہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے تحلیل شدہ اسمبلیاں بحال نہ ہوں گی۔ (ستم ظریفی یہ ہے کہ تحلیل کو خلاف قانون قرار دینا بذات خود مردے کو زندہ کرنے کے مترادف تھا)

نئے انتخابات کی داغ بیل پڑ گئی اور ان کا پروگرام ترتیب دیا گیا۔ اس طرح پیپلز پارٹی کے اقتدار کی راہ ہموار ہو گئی۔ یہ فیصلہ جو حکمرانوں کو از حد مطلوب تھا، صدر ضیاء کی روز افزوں اور ابھرتی ہوئی مقبولیت کی راہ میں دیوار حائل کرنے سے مماثلت رکھتا تھا۔ لیکن یہ عارضی ثابت ہوئی کیونکہ یہ وہ بند نہ تھا، جو طوفانی موجوں کی راہ میں حائل ہو سکتا۔

ایسا لگتا ہے کہ نئی قائم ہونے والی پیپلز پارٹی کی حکومت کا اصل کام صرف صدر ضیاء کے آٹھ سالہ (85-1977) دور میں کئے گئے ہر کام کو تباہ و برباد کرنا ہے۔ چنانچہ اس مقصد کے پیش نظر صدر ضیاء کے خلاف زہر اگلنے کی ایک مہم شروع کی گئی۔ 1970ء کے عشرہ میں بھٹو کے دور میں جو لادین فضا پیدا کی گئی، اس کی تجدید کی جا رہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ واحد صنعت جس پر

حکومت کی توجہ مرکوز ہے، وہ ''پروپیگنڈہ'' ہے۔ نام نہاد ترقی پسندوں کو اس کی سربراہی سونپی گئی ہے جو ہر اسلامی قدر کا حلیہ بگاڑنے اور مغرب کی اباحیت کو رائج کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

افسوس ناک امر یہ ہے کہ افغان مشن کو مسخ کر دیا گیا ہے۔ پاکستان نے اس سلسلے میں اتنی عظیم قربانیاں دی ہیں کہ کسی قوم کی طرف سے کسی دوسری قوم کی آزادی کے لئے ایسی قربانیوں کی مثال نہیں ملتی۔ اس میں شک نہیں کہ جذبہ ایثار کے ساتھ اپنے دفاع کا مفاد بھی ان سے وابستہ تھا لیکن ایک اسلامی حکومت کا قیام جو منتہائے مقصود تھا، دونوں کے درمیان مشترک تھا۔ پیپلز پارٹی کی وفاقی حکومت جو پنجاب کی اسلامی جمہوری اتحاد کی حکومت اور افواج پاکستان کے درمیان جکڑی ہوئی ہے، پوری کوشش کر رہی ہے کہ افغان مسئلہ کو لادینی رنگ دیا جا سکے۔ ایک طرف تو اسلام کے شیدائی افغان مجاہدین کے کابل میں مستحکم ہونے کی راہ میں رکاوٹیں ڈالی جا رہی ہیں تو دوسری طرف اشتراکی پی ڈی پی اے یا ظاہر شاہ کے سامنے آنے کے لئے دروازے وا کئے جا رہے ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ اسلام آباد کے رشتے بھارت سے مضبوط بنانے کی کوششیں ہو رہی ہیں جسے روس اور امریکہ نے اس علاقے میں سپر پاور نامزد کر رکھا ہے۔ حالانکہ دنیا میں مسلمانوں کی سب سے زیادہ تعداد اسی علاقے میں آباد ہے۔ شہید صدر کی کردار کشی کے ساتھ ملک کو اسلامی راہ سے ہٹانے کی کوششیں بھی جاری ہیں۔ تاہم صدر ضیاء کے اثرات ملک کے روزمرہ رسم و رواج اور مزاج میں اتنے گہرے ہیں کہ ملک میں اسلامی اقدار کی ترویج ہو یا سیاسی ڈھانچہ، افغانستان کا مسئلہ ہو یا بھارت سے تعلقات کا مسئلہ، کوئی کوشش بھی ملک کو اس ڈگر سے نہیں ہٹا سکتی، جس پر انہوں نے اسے ڈال دیا ہے۔

یہ تو ایک چڑھتا دریا ہے، جس کی راہ میں اسلام دشمن عناصر جتنی رکاوٹیں ڈالیں گے، صدر ضیاء کی حامی قوتیں انہیں خس و خاشاک کی طرح بہا لے جائیں گی۔ جب یہ طوفان ان عارضی

رکاوٹوں کو پھلانگ جائے گا تو صدر ضیاء الحق کے نظریہ کی بالا دستی کا دور شروع ہوگا۔ خواہ اس وقت ملک پر حکومت کسی کی بھی کیوں نہ ہو۔ ایک انسان کی اصل عظمت اسی میں پوشیدہ ہے۔ اس وقت اسلام کے حامی اور لادینیت کی علمبردار قوتوں میں ایک فیصلہ کن معرکہ برپا ہے۔ تمام اسلام دشمن طاقتیں لادینیت کی فکر کے تحفظ کے لئے یکجا ہو چکی ہیں لیکن کوئی وقت جاتا ہے کہ عوام کی ذہنی ساخت اور سوچ مل کر اسی طرح حاوی اور غالب ہو جائے گی جس طرح ہندوازم کے مقابلے میں پاکستان کے حصول کے لئے ہوگئی تھی۔ میری رائے میں ضیاء الحق واحد لیڈر ہیں، جنہیں قائداعظمؒ کے بعد مقام دیا جا سکتا ہے۔ قائدؒ ہی کی طرح انہوں نے اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے ایک نئے باب کا آغاز کیا ہے۔

جنرل محمد ضیاء الحق شہید

میاں طفیل محمد

جنرل محمد ضیاء الحق سے میرا جو بھی رابطہ ہوا، وہ پاکستان قومی اتحاد اور اس کے رہنماؤں کے ذریعہ سے ہوا۔ میں اس سے پہلے انہیں جانتا ہی نہ تھا اور نہ ان سے کسی اور حیثیت سے متعارف تھا۔ بلکہ میرا خیال ہے پاکستان کے عوام کو بھی 1977ء میں مارشل لاء کے نفاذ کے بعد پتہ چلا کہ پاکستانی افواج میں جنرل محمد ضیاء الحق نام کا کوئی جرنیل بھی ہے۔

جہاں تک پاکستان میں مارشل لاء کے نفاد اور جنرل ضیاء الحق کے اقتدار سنبھالنے کا تعلق ہے تو پوری پاکستانی قوم شاہد ہے کہ جنرل ضیاء نے یہ انتہائی قدم صرف اس وقت اٹھایا جب اس وقت کے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے اپنے شخصی اقتدار کو دوام بخشنے اور کسی مخالف قوت کے وجود کے بغیر حکمرانی کے خواب کو پورا کرنے کے لئے 1977ء کے انتخابات میں بے دردی اور ڈھٹائی کے ساتھ دھاندلی برتی اور پوری قوم اس کے خلاف احتجاج کے طور پر سڑکوں پر نکل آئی۔ عوامی مخالفت کی اس لہر پر قابو پانے کے لئے مسٹر بھٹو نے طاقت کا وحشیانہ استعمال کیا اور لاٹھی سے گولی تک اور خوف وہراس سے گرفتاریوں تک ہر حربہ استعمال کیا عمر، جنس یا مرتبہ کا لحاظ کئے بغیر ہزاروں بے گناہ پاکستانیوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا، زخمی کیا گیا یا جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا گیا۔ مسجدیں بھی جن کا احترام مسلمہ سمجھا جاتا ہے، ان کے غیض وغضب اور انتقامی جذبہ کا شکار بننے سے نہ بچ سکیں اور ان کے اندر بھی مذہبی رہنماؤں اور عام لوگوں کا خون بے دریغ بہایا گیا۔ اس حد تک خوف وہراس پھیلایا گیا کہ عام لوگ تو در کنار خود ان کے قائدین بھی دعائیں مانگنے لگے کہ بھٹو صاحب کی فیڈرل سیکیورٹی فورس اور ان کے مسلح جیالوں کی

زیادتیوں کے خلاف مسلح افواج کوئی کارروائی کریں۔

پورے ملک میں صرف اس دعا کی گونج سنائی دیتی تھی ''ربا ساڈی اک دعا، بھٹوساڈے مگروں لاہ'' عام تاثر اور وسیع پیمانہ پر یہ خدشہ تھا کہ 5 جولائی کو ملک بھر میں حزب اختلاف کے ہزاروں لیڈروں خاص طور پر بڑے بڑے لیڈروں کا قتل عام ہوگا۔ 5 جولائی کی صبح جب عوام کو یہ خبر ملی کہ پاکستانی افواج نے ملک کی زمام کار سنبھال کر انہیں بھٹو کے شکنجے سے نجات دلا دی ہے تو ملک بھر میں ایسا جشن منایا گیا، جس کی پہلے کوئی مثال نہیں ملتی۔ لوگوں نے پارٹیاں اور دعوتیں منعقد کیں، یار واحباب میں مٹھائیں تقسیم کی گئیں اور پورے ملک نے سکھ کا سانس لیا۔

ملک بھر میں اتنے بڑے پیمانے پر مٹھائیاں بنائی گئیں کہ چینی اور سوجی کا عارضی طور پر قحط پڑ گیا۔ کیونکہ یہی دو اشیاء پاکستانی مٹھائیوں کا بنیادی جزو ہیں۔ پاکستان قومی اتحاد کے صدر مرحوم مفتی محمود کو عوام سے اپیل کرنی پڑی کہ وہ جشن منانے کے لئے اس پیمانے پر مٹھائی بنانا بند کردیں۔ جولائی 1977ء میں پاکستانی افواج نے عوام کی دعاؤں کے جواب اور قائدین کی تائید سے اقتدار سنبھالا۔ اس طرح ملک ایک خوفناک قتل عام سے بچ گیا جس کا چھوٹے پیمانے پر نمونہ حکمران جماعت کی طرف سے لاہور کے عوام دیکھ چکے تھے۔

جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ مسٹر بھٹو اور قومی اتحاد میں سمجھوتہ ہوگیا تھا۔ جسے فوج نے سبوتاژ کردیا انہیں چاہئے کہ وہ پاکستان قومی اتحاد کے سیکرٹری جنرل کی کتاب ''پھر مارشل لاء آ گیا'' پڑھیں جس میں اس دور کے پیش آمدہ واقعات کو مستند طریقے سے بیان کردیا گیا ہے۔ یہ کتاب واضح کردیتی ہے کہ 4 جولائی 1977ء کو مسٹر بھٹو اور مخالف جماعتیں کہاں کھڑی تھیں اور ان کا موقف کیا تھا۔ خان محمد اشرف خان نے بھی ہماری یادداشت کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی ہے اور یاد دلایا ہے کہ 4 جولائی کی شب قومی اتحاد کے تمام قائد سردار عبدالقیوم خان کے ہاں کھانے پر جمع

تھے۔ کھانے کے بعد ائر مارشل اصغر خاں اور دوسرے کچھ لیڈروں کی تجاویز پر طویل گفت وشنید ہوئی لیکن اتفاق رائے نہ ہوسکا اور سب لوگ یہ فیصلہ کئے بغیر منتشر ہو گئے کہ آیا مسٹر بھٹو سے کوئی معاہدہ ہو بھی سکتا ہے یا ان کے خلاف قومی سطح پر تحریک چلانے کی ضرورت ہے۔ قومی اتحاد کے لیڈروں کو شک تھا کہ پیپلز پارٹی سے کوئی معاہدہ ہو بھی جائے تو کیا اس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ پیپلز پارٹی اپنا اعتبار اس لئے بھی کھو چکی تھی کہ ایک طرف تو اس کے لیڈر حزب اختلاف سے بات چیت کا ڈھونگ رچائے ہوئے تھے اور دوسری طرف پوری ڈھٹائی سے مسلح تصادم کے لئے وسیع اور خطرناک پیمانے پر اپنے کارکنوں کو مسلح بھی کر رہے تھے۔ اپنے ہم خیال افسروں سے ساز باز کر رہے تھے اور ان کے صف اول کے رہنما مسلسل دھمکی آمیز بیانات جاری کر رہے تھے۔

جنرل ضیاء الحق کے بارے میں یہ الزام کہ وہ مارشل لاء کے نفاذ کے بعد 90 دنوں میں انتخابات کرانے میں ناکام رہے (جس کا انہوں نے وعدہ کیا تھا) کوئی وزن نہیں رکھتا۔ قومی اتحاد کے بعض ممتاز رہنماؤں نے خود ہی ''پہلے احتساب، پھر انتخاب'' کی رٹ لگانی شروع کر دی تھی۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ اگر سیاسی میدان کو بدعنوان اور بے ایمان عناصر سے پاک کئے بغیر انتخاب کرا دیئے گئے تو یہی لوگ پھر اکٹھے ہو جائیں گے اور مارشل لاء کے نفاذ کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ آج کچھ لوگ دلیل دیتے ہیں کہ فوج نے اس مطالبہ کو الیکشن ملتوی کرنے کا بہانہ بنا لیا اور اس طرح اپنے اقتدار کو طول بخشا لیکن کوئی باشعور انسان اس دلیل کے وزن اور حقانیت سے انکار نہیں کرسکتا۔ پھر کیوں نہ باور کیا جائے کہ فوج نے اسے پورے خلوص سے قبول کیا ہو۔ پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بدعنوان لوگوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لئے احتساب مکمل کیوں نہ ہوا۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہوسکتا ہے کہ پاکستان میں بڑی مچھلیوں پر ہاتھ ڈالنے کی روایت ہی

نہیں۔ پاکستان میں مجرموں، اغوا کرنے والوں، بلیک مارکیٹ کرنے والوں سے سودا کر کے ان کے شکار لوگوں کو چھڑایا تو جا سکتا ہے لیکن ان کے سرپرستوں کی بیخ کنی کا کوئی رواج نہیں ہے۔

یہ جبھی ممکن ہوگا جب ملک پر ایسے خوف خدا رکھنے والے لوگوں کی حکومت قائم ہو جو روز آخر کی باز پرس کا احساس رکھتے ہوں۔ اپنے گیارہ سالہ دور حکومت میں جنرل محمد ضیاء الحق مسلسل یہ اعلان کرتے رہے کہ انہیں جو ڈھانچہ ورثے میں ملا ہے، وہ پوری طرح گل سڑ چکا ہے۔ جو کام پہلے 50 روپے میں ہوتا تھا، اب 500 روپے میں ہوتا ہے۔ صدر ضیاء الحق نے قومی ترقی اور عوام کی بہبود کے جو کام کیے بھی تھے، انہیں موجودہ نام نہاد عوامی حکومت مرحلہ وار ختم کر رہی ہے۔

عام طور پر الزام لگایا جاتا ہے کہ جنرل ضیاء الحق ایک ڈکٹیٹر تھے۔ ستم ظریفی ملاحظہ فرمایئے کہ اسی ڈکٹیٹر نے اپنے گیارہ سالہ دور اقتدار میں تین مرتبہ بلدیاتی اداروں کے انتخابات منعقد کرائے اور جمہوریت کے نام نہاد علمبرداروں کی شدید مخالفت کے باوجود بار بار پارلیمنٹ کے قیام کی کوشش کی۔ ان رکاوٹوں کے علی الرغم انہوں نے دو مرتبہ پارلیمنٹ کے انتخاب میں کامیابی حاصل کی اور تیسری مرتبہ اس کوشش کے دوران اپنی جان دے دی۔ جب ملک میں مارشل لاء نافذ تھا، تب بھی پریس پر کوئی پابندی نہ تھی اور وہ پوری طرح آزاد تھا۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ وہ ڈکٹیٹر تھے تو عجیب ڈکٹیٹر تھے کہ ایک معمولی آدمی بھی ان کے منہ پر دل کی بات کہہ سکتا تھا۔ شخصیت یا کارروائیوں پر انتہائی زہریلی تنقید پر نہ غصہ کا اظہار کرتے نہ ناپسندیدگی کا اور انہوں نے کبھی کسی کے خلاف انتقامی کارروائی نہیں کی۔

جنرل ضیاء الحق کے خلاف سنگین ترین الزام ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دینے سے تعلق رکھتا

ہے۔ میں اس سلسلے میں ایک سیدھا سا سوال کرنا چاہتا ہوں۔ کیا ذوالفقار علی بھٹو خود تختہ دار تک پہنچنے کے ذمہ دار تھے یا جنرل ضیاء الحق نے ان کے گلے میں پھانسی کا پھندہ ڈالا تھا؟ اس سارے سلسلہ واقعات میں ضیاء الحق کا اصل کردار کیا تھا؟

ہوا یوں کہ مسٹر بھٹو کی فیڈرل سیکیورٹی فورس کے چار ارکان نے خود اپنی پارٹی کے ایک معزز ممبر پر اس وقت حملہ کیا، جب وہ اپنے والد کے ہمراہ ایک شادی میں شرکت کے بعد واپس آ رہے تھے۔ مسٹر بھٹو احمد رضا قصوری کا خاتمہ چاہتے تھے لیکن ان کے والد نواب محمد احمد خان ان گولیوں کا شکار ہو گئے جو احمد رضا قصوری پر چلائی گئی تھیں۔ اسی رات احمد رضا قصوری نے اچھرہ تھانے میں ایف آئی آر درج کرادی جس میں صاف صاف دعویٰ کیا گیا تھا کہ ان پر حملہ ذوالفقار علی بھٹو کے احکامات پر کیا گیا۔ نیز یہ کہ ذوالفقار علی بھٹو نے اس سے پہلے بھی ان کے آبائی شہر قصور میں قتل کرانے کی کوشش کی تھی۔ چونکہ اس وقت ذوالفقار علی بھٹو وزیر اعظم تھے، اس لئے اس رپورٹ پر کوئی کارروائی نہیں کی گئی اور یہ کیس جب تک وہ برسر اقتدار رہا، دبا رہا۔ جب حکومت بدلی تو احمد رضا قصوری اپنا مقدمہ عدالت میں لے گئے۔ چونکہ اس مقدمہ میں ایک وزیر اعظم ملوث تھا، اس لئے اس کی سماعت ہائی کورٹ میں ہوئی اور پھر اس کی اہمیت کے پیش نظر ہائی کورٹ کا فل بنچ تشکیل دیا گیا، جو پانچ ججوں پر مشتمل تھا۔

مقدمے کی سماعت کھلے بندوں ہوئی اور ملزم کو اپنے دفاع کا پورا موقع دیا گیا۔ اس فل بنچ نے مقدمے کی سماعت کے بعد ذوالفقار علی بھٹو کو نواب محمد احمد خان کے قتل کا ذمہ دار ٹھہرایا اور ان کو پھانسی کی سزا کا مستوجب گردانا۔ یہ تاریخی فیصلہ پی ایل ڈی میں چھپ کر ریکارڈ کا حصہ بن چکا ہے اور اس کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

مسٹر بھٹو نے اس فیصلہ کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل دائر کی، جس کے نو ججوں پر مشتمل بنچ

نے ایک سال تک کھلی عدالت میں سماعت کی۔ اس مقدمہ کی کارروائی کو ملکی اور بین الاقوامی ذرائع ابلاغ کے نمائندوں نے سنا۔ یہاں بھی مسٹر بھٹو کو قانونی ماہرین کی مدد سے اپنے دفاع کا پورا حق دیا گیا۔ انہوں نے پسند کیا کہ وہ اپنے مقدمہ کی خود بھی پیروی کریں اور چند معروف قانون دان بھی ان کا مقدمہ لڑیں۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ انہوں نے خود عدالت سے استدعا کی کہ ان کا یہ بیان مقدمہ کے ریکارڈ کا حصہ بنایا جائے کہ وہ سماعت کی کارروائی سے بالکل مطمئن ہیں اور عدالت کے ہر فیصلے کو برضا و رغبت قبول کریں گے۔ سپریم کورٹ نے ہائی کورٹ کا فیصلہ برقرار رکھا۔

مسٹر بھٹو کے حامی اکثر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ جنرل ضیاء ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے فیصلوں سے صرف نظر کر سکتے تھے اور مسٹر بھٹو کو رہا کر سکتے تھے۔ انہوں نے ایسا کیوں نہ کیا؟ اب حقیقت یہ ہے کہ جذباتی وابستگی ایک علیحدہ چیز ہے ورنہ کوئی معقول انسان جس کے دل میں انصاف کا پاس اور خوف خدا موجود ہو، ایک ایسے سربراہ حکومت کا دفاع کر سکتا ہے جو ایک معصوم شہری کے قتل کا مرتکب ہوا ہو، جبکہ اس کے منصب کا اولین تقاضا ہی لوگوں کے جان و مال اور عزت و آبرو کا تحفظ ہو۔ ایسے سربراہ حکومت سے زیادہ ظالم کون ہو سکتا ہے اور کون اس سے زیادہ بدترین سزا کا مستحق ٹھہرے گا۔

مسٹر احمد رضا خاں قصوری پر اس سے پہلے مسٹر بھٹو نے دو مرتبہ قصور میں قاتلانہ حملہ کرایا تھا۔ اس سے پہلے ڈاکٹر نذیر، خواجہ رفیق، مولانا شمس الدین، عبدالصمد اچکزئی کے سیاسی قتل بھی ان ہی کے کھاتے میں درج ہو چکے تھے۔ ان کے علاوہ لاتعداد فیکٹری مزدور، طلبہ، عام شہری جن میں خواتین بھی شامل تھیں، وزیر اعظم کے حکم پر موت کے گھاٹ اتارے جا چکے تھے بلکہ دینی رہنماؤں کو مساجد کے اندر شہید کیا جا چکا تھا۔ مسٹر بھٹو کو جس مقدمے میں سزا ہوئی، وہ نہ تو

جنرل ضیاء الحق نے درج کرایا تھا اور نہ ان کے اشارے پر اس کی ابتداء ہوئی تھی۔ یہ تو ان کے اپنے ایک ساتھی نے درج کرایا تھا جس کو ٹھکانے لگانے میں وہ ناکام رہے تھے۔ ان حالات میں اگر جنرل ضیاء الحق ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے فیصلوں کو پس پشت ڈال کر مسٹر بھٹو کی جان بخشی کر دیتے تو یہ قانون کی حرمت کے خلاف فعل ہوتا۔ ہمیں بھی مسٹر بھٹو کے المناک انجام کا دکھ ہے۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے بڑی صلاحیتوں سے نوازا تھا جس سے صحیح کام لے کر وہ ملک وملت کی عظیم خدمات سرانجام دے سکتے تھے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے انہیں راہ راست پر لانے کی بہت کوشش کی لیکن انہوں نے ایک نہ مانی اور اپنے طور اطوار سنوارنے کے لئے تیار نہ ہوئے۔ خود مجھے مسٹر بھٹو کے اصرار پر اس دور کے گورنر پنجاب مسٹر کھر کے ہاتھوں لاہور جیل میں بدسلوکی کا نشانہ بنایا گیا۔ بعد میں گورنر ہاؤس لاہور میں انہوں نے اس پر معذرت بھی چاہی۔ میں نے ان پر واضح کر دیا تھا کہ ہم جو بھی عمل کرتے رہے، وہ رضائے الٰہی کے لئے ہوتا ہے اور اس راہ میں جو مشکل بھی پیش آئے، یا ذلت و رسوائی برداشت کرنی پڑے، اس کی جزاء کی خدا سے ہی امید رکھتے ہیں۔ ہمیں نہ تو ان سے کوئی شکایت ہے اور نہ ہم کسی انتقام کے خواہاں ہیں۔ میں نے انہیں اور ان کے ساتھیوں کو مشورہ دیا کہ وہ خود ہی اپنے طرز عمل کا جائزہ لیں اور اس کی اصلاح کریں۔

میں مسٹر بھٹو کے حامیوں اور اعزہ کو بھی مشورہ دوں گا کہ جنرل ضیاء الحق کے خلاف دشنام طرازی ترک کر کے اپنا وقت، روپیہ اور مساعی مسٹر بھٹو کے نام پر کسی تعمیری اور فلاحی کام میں صرف کریں تا کہ قوم کو اس کا کوئی فائدہ پہنچ سکے اور آنے والی نسلیں انہیں یاد کریں۔ جنرل ضیاء پر الزامات سے انہیں کچھ حاصل نہ ہوگا۔

جنرل ضیاء الحق کے جنازہ پر بین الاقوامی طور پر جس بے ساختہ اور بے مثال اتحاد کا مظاہرہ

ہوا، اس سے دنیا پر واضح ہوگیا کہ دنیا بھر کے مسلمانوں کی نگاہ میں ان کا مقام کیا تھا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ ہمیں جنرل ضیاء کی اہلیت اور تقویٰ کا حامل کوئی دوسرا حکمران کب نصیب ہوگا؟ یہ تو اللہ میاں کی ہماری قوم سے ناراضگی کا اظہار ہے کہ ہماری ناشکری کی وجہ سے ضیاء الحق جیسا حکمران ہم سے چھن گیا اور ایک ایسی ناتجربہ کار خاتون ہم پر مسلط ہوگئی جو ضیاء سے سخت نفرت کرتی ہے اور صفات کے مقابلے میں ان کی ضد ہے۔ پھر دیکھیں کہ اللہ نے اس خاتون سے پہلا کام یہ کرایا کہ اس نے اس بھارت کے وزیراعظم کو اسلام آباد میں خوش آمدید کہا، جس کے خلاف اس کے والد نے ہزار سالہ جنگ کا راگ الاپا تھا۔ دوسری ذلت اس کے مقدر میں یہ آئی کہ اسے اسی برطانیہ کے قدم چومنے پڑے، جسے اس کے والد نے دھتکار دیا تھا۔ اس طرح گویا اپنا تھوکا چاٹنا پڑا۔

اللہ تعالیٰ نے شہید ضیاء الحق کو جو غیرت واحترام نصیب فرمایا، وہ تاریخ کے صفحات پر نقش ہو چکا ہے۔ انہیں اللہ کا یہ کرم جہاد افغانستان کی غیر متزلزل حمایت اور وہاں کے مسلمانوں پر توڑے گئے مظالم کے خلاف ہمدردی کے نتیجہ میں نصیب ہوا۔ ضیاء الحق نے اس وقت اپنے ملک کے دروازے افغان مجاہدین پر کھولے، جب پوری دنیا کی متفقہ رائے یہ تھی کہ روس جیسی جابر اور بے اصول سپر پاور کے ساتھ مخاصمت مول لینے کے بارے میں سوچنا بھی اپنی تباہی اور بربادی کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ لیکن جنرل ضیاء الحق کو اپنے خالق پر پورا یقین اور اعتماد تھا۔ انہوں نے خوب سوچ سمجھ کر افغان مجاہدین کی مدد کا فیصلہ کیا اور پھر اس پر ڈٹے رہے۔

یہ ضیاء کے ایمان کامل کا ہی نتیجہ تھا کہ بالآخر روس کو اپنی شکست تسلیم کر کے افغانستان سے اپنی فوجیں واپس بلانا پڑیں۔ خدا نے ضیاء الحق کو اتنی عزت بخشی کہ اس سے بڑھ کر سوچا بھی نہیں جاسکتا۔ یہ اعزاز کیا کم ہے کہ روز محشر جنرل ضیاء الحق اپنی کمانڈر ان چیف کی وردی میں 15 لاکھ

افغان مجاہدین اور اپنے دوسرے جرنیلوں کے جلو میں خدا کے حضور پیش ہوں گے۔ ان کے ہم عصروں میں کوئی شخص بھی صحیح معنوں میں فیلڈ مارشل کے لقب کا مستحق نہیں بنا۔ ضیاء الحق شہید نے افغان مجاہدین کے گروپوں کے تعاون سے دنیا کی عظیم ترین طاقت روس کو ذلت آمیز شکست سے دوچار کر دیا۔ تاریخ گواہی دے گی کہ عظیم مسلم جرنیل صلاح الدین ایوبی کے بعد صرف جنرل ضیاء الحق نے اللہ کی مدد سے اتنا عظیم کارنامہ سرانجام دیا۔

جنرل ضیاء الحق نے کبھی انسانی کمزوریوں سے پاک ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ وہ ہمیشہ کہتے تھے کہ وہ لغزشوں اور غلطیوں کے حامل انسان ہیں۔ انہوں نے تسلیم کیا کہ بار بار کے وعدوں کے باوجود اور پوری کوشش کے علی الرغم وہ اسلامی قوانین کے نفاذ میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ تاہم جس سلطنت پر انہیں پورا کنٹرول حاصل تھا، یعنی اپنی روح و جسم اور اپنے خاندان پر انہوں نے شریعت پوری طرح نافذ کر رکھی تھی۔

اپنے اس اعتراف کے باوجود جب قوم متفقہ طور پر ان کی پشت پر تھی تو انہوں نے صرف آٹھ ماہ میں درج ذیل معاملات کے بارے میں اسلامی قوانین نافذ کر دیئے:

۱۔ قذف

۲۔ زنا اور بدکاری

۳۔ ڈاکہ زنی

۴۔ چوری

۵۔ جواء اور شراب نوشی

۶۔ شہادت

۷۔ قیام صلوٰۃ اور دفتروں میں نماز کا قیام

۸۔ زکوٰۃ اور عشر کی وصولی اور تقسیم

۹۔ شرعی عدالتیں

۱۰۔ اسلام آباد میں بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کا قیام

۱۱۔ دینی مدارس کی سندوں اور سرٹیفکیٹوں کو دیگر یونیورسٹیوں کی ڈگری کے مساوی قرار دلانا اور ان پر ملازمت کے دروازے کھولنا

۱۲۔ ایمرجنسی کا اس انداز پر خاتمہ کہ آئندہ انشاء اللہ بھٹو کی طرح کوئی بھی اسے نافذ نہ کر سکے گا۔

۱۳۔ پریس کو مارشل لاء میں بھی اور اس کے بعد ایسی آزادی دینا جو کسی نام نہاد جمہوری دور میں بھی اسے نصیب نہ ہوئی۔

۱۴۔ سرکاری رہائش گاہوں اور ہوٹلوں نیز تقریبات سے شراب کا خاتمہ

۱۵۔ پی آئی اے کے جہازوں میں پرواز سے پہلے قرآنی دعا کا نشریہ

۱۶۔ حکومتی سطح پر سیرت کمیٹیوں کا قیام اور بین الاقوامی سیرت کانفرنسوں کا انعقاد

۱۷۔ مختلف زبانوں میں سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صدارتی انعامات کا اجراء۔

۱۸۔ علماء اور دینی رہنماؤں کو قومی سطح پر ان کے مقام کے مطابق احترام اور عزت۔

۱۹۔ اندرون ملک اور بین الاقوامی طور پر قومی زبان اور لباس کی ترویج اور احترام۔

۲۰۔ تمام نجی اور سرکاری تقریبات حتیٰ کہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں بھی اسلامی طور طریقوں اور رکھ رکھاؤ کا تعارف۔

۲۱۔ سرکاری ذرائع ابلاغ، ریڈیو، ٹی وی اور پریس ٹرسٹ سے خدا بیزار اور دین دشمن عناصر کا اخراج اور ان کے رویوں کو اسلامی نکتہ نظر سے استوار کرنا اور قومی جہت دینا۔

۲۲۔ غیر جماعتی بنیادوں پر انتخابات کا انعقاد۔

۲۳۔ مارشل لاء کے خاتمہ کے لئے انتخابات کرانے کی مساعی اور اس سلسلے میں اقدامات۔

اس جہت میں چند واقعات کی مندرجہ ذیل تفصیلات قابل ذکر ہیں:

(الف) نومبر ۱۹۷۷ء میں خود سیاسی قائدین نے ''پہلے احتساب، پھر انتخاب'' کا مطالبہ کر کے خود انتخابات ملتوی کرائے۔

(ب) نومبر ۱۹۷۹ء میں جب انتخابات کے تمام انتظامات کر لئے گئے، کاغذات نامزدگی داخل ہو گئے اور ووٹ ڈالنے کے پروگرام کا اعلان ہو گیا تو بہت سی اہم سیاسی جماعتوں (جن میں قومی اتحاد میں شامل جماعتیں بھی تھیں) انتخابات کا بائیکاٹ کر دیا۔ چنانچہ انتخابات پھر ملتوی کرنے پڑے۔

(ج) اس سانحہ کے بعد ایک نامزد پارلیمینٹ کے ذریعہ جمہوریت کی بحالی کا تجربہ کیا گیا۔

(د) فروری ۱۹۸۵ء میں جب سیاسی کشمکش بہت بڑھ گئی تو غیر جماعتی بنیادوں پر قومی اور صوبائی اسمبلیوں کا انتخاب ہوا۔ اس عرصے میں جمہوریت کے نام نہاد علم برداروں کی طرف سے تمام رکاوٹوں کے باوجود تین مرتبہ بلدیاتی انتخابات منعقد ہوئے اور اس طرح مقامی حکومت خود اختیاری کا نظام مستحکم ہوا اور جو آج بھی کامیابی سے چل رہا ہے۔

(ر) نومبر ۱۹۸۸ء میں عام انتخابات کے انعقاد کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔

۲۴۔ جنرل ضیاء الحق کا نمایاں ترین اور ناقابل فراموش کارنامہ افغان جہاد میں ان کی کامیابی ہے۔ ملک کی تاریخ میں کسی رہنما کا کوئی کام بھی اہمیت کے اعتبار سے اس کا ہم پلہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

شہید جنرل محمد ضیاء الحق

جنرل ریٹائرڈ رحیم الدین خان

عزیزی اعجاز الحق نے جب سے مجھے جنرل محمد ضیاء الحق پر کچھ لکھنے کے لئے کہا ہے، میں اس سوچ میں پڑ گیا ہوں کہ جس شخص کو میں اتنی اچھی طرح جانتا تھا، ان پر جب بھی لکھنے بیٹھا ہوں، تو جنرل ضیاء الحق کی یاد کچھ اس طرح آتی ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یادوں کے اس سلسلے کو کہاں سے شروع کروں اور ان کی ہمہ جہتی کو گرفت میں لاؤں تو کیسے؟ مجھے یقین ہے کہ اس کیفیت سے ہر وہ شخص دوچار ہوگا، جو ان کی یاد میں کچھ لکھنا چاہے گا۔ لیکن جہاں ایک طرف میں کچھ نہ لکھ کر اعجاز کا دل دُکھا نہیں سکتا، وہاں دوسری طرف یہ احساس بھی کچھ خوش کن نہیں کہ جنرل ضیاء الحق جیسے اعلیٰ اوصاف کے حامل انسان پر کچھ نہ لکھ کر میں ان کے ساتھ ناانصافی کا مرتکب ہوں۔ وہ نہ صرف مجھے بے حد عزیز تھے بلکہ میرے لئے انتہائی قابل احترام بھی۔

مجھے شہید جنرل محمد ضیاء الحق کے ساتھ کام کرنے کا موقع اس وقت ملا جب وہ چیف آف آرمی سٹاف (COAS) کے عہدے پر فائز تھے اور میں پہلی دفعہ GHQ میں پوسٹ ہو کر آیا۔ میں اس وقت میجر جنرل تھا۔ جنرل ضیاء الحق کا تعلق چونکہ آرمرڈ کور سے تھا، اس لئے عموماً ان کا قرب بھی آرمرڈ کور ہی کے افسروں کو حاصل تھا۔ ان کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ جن لوگوں نے ان کے ساتھ ماضی میں کام کیا ہوتا تھا، وہ انہیں عزیز رکھتے، اکثر معاملات میں ان کی بات پر کان دھرتے اور ان کی رائے کو دوسروں پر ترجیح دیتے۔ آئندہ زندگی میں انہیں اپنے اس رویہ سے بعض موقعوں پر تکلیف بھی اٹھانی پڑی۔

ان کی تصویر جو بار بار میرے سامنے آتی ہے، وہ ایک ایسے انسان کی ہے، جو سادگی کا مجسمہ

تھا۔خوش اخلاقی وخوش مزاجی ان کی سرشت تھی۔دراصل ضیاء الحق اس تہذیب کی یادگار تھے، جس میں ملنے ملانے میں ادب واحترام کا بہت لحاظ رکھا جاتا تھا۔یہ ان کی وضع داری ہی تھی کہ وہ ہر ایک سے اس خندہ پیشانی سے ملتے۔ ملنے والے کو یہ احساس کبھی نہ ہوتا کہ وہ ان سے کمتر ہے۔گرمجوشی، شائستگی اور انکساری ان کی شخصیت کا حصہ تھا۔اس میں تصنع اور بناوٹ کو دور دور کا دخل نہ تھا۔ان کی شرافت ہر ملنے والے کو متاثر کرتی تھی۔گو اب وہ ہم میں نہیں ہیں لیکن ان کے کردار اور ان کی سیرت نے لوگوں کے دلوں پر ایسے نقوش چھوڑے ہیں جو ہمیں اس بات کی یاد دہانی کراتے رہتے ہیں کہ وہ ہم سے جدا تو ضرور ہو گئے ہیں لیکن مرے نہیں کہ ان کے یہی نقوش تو زندگی کے کٹھن سفر میں مدتوں ہمارے اور آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے مشعل راہ کا کام دیں گے۔

وہ انتہائی پریشانی کے موقعوں پر بھی ضبط وتحمل اور ہمت واستقلال کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرتے۔وہ نہ صرف خود بد سے بدتر حالات میں بھی کسی قسم کی گھبراہٹ کا احساس نہیں ہونے دیتے تھے بلکہ ان کے ساتھیوں میں سے اگر کوئی کسی وجہ سے پریشانی کا اظہار کرتا بھی تو وہ ان کے لئے سہارے کی چٹان بن جاتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جنرل ضیاء الحق کی سب سے نمایاں خصوصیت ان کی جرات اور حالات سے کبھی زچ نہ ہونے کی صلاحیت تھی۔وہ فطرتاً ہر مسئلے کے روشن پہلو کو دیکھنے کے قائل تھے۔یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ ضیاء الحق کے کردار کی پختگی اور ان کے نڈرپن میں ان کی قوت ایمان کو سب سے زیادہ دخل تھا۔وہ صوم وصلوٰۃ کے پابند، تہجد گزار، عاشق رسول ﷺ اور دین اسلام کے ہر لحاظ سے شیدائی تھے۔

جنرل ضیاء الحق مزاجاً نفاست پسند تھے۔ہر کام نہایت صفائی، تنظیم اور بغیر کسی گنجلک کے پسند کرتے تھے۔جو چیز بھی ان کے نام سے پیش ہونا ہوتی تھی، اسے نہایت خوبصورتی اور خوش

ذوقی سے پیش کرتے تھے۔اپنی ذاتی زندگی میں بھی ان کا ہر عمل ان کی جسمانی اور روحانی صفائی ستھرائی اور نفاست کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

جنرل ضیاء الحق نہایت ہی صبر والے انسان تھے۔سب کی بات نہایت تحمل سے سنتے۔خاص طور سے ضرورت مندوں کی درخواستیں اور فریادیں سننے کے لئے ان کے پاس کبھی وقت کی کمی نہ ہوتی۔عیدین پر صبح سے رات گئے تک مسلسل ہر طرح کے انسانوں سے ملتے۔ان کی شکائتیں اور تکالیف کی روئیدادیں سنتے۔لوگوں کو تسلی دلاسا دیتے اور جہاں ضرورت سمجھتے، وہاں ان شکایات کو دور کرنے کے لئے احکامات بھی جاری کرتے۔ایسی شکایات اور اپنے احکامات پر عملدر آمد کو یقینی بنانے کے لئے آرمی ہاؤس کے پاس مختصر اسٹاف کے ساتھ ایک چھوٹی سی سیکرٹریٹ بھی قائم کی تھی۔

جہاد افغانستان میں انہوں نے جس طرح بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، وہ ان کے جذبہ ایمان، ہمت وجرات اور مشکل ترین حالات میں ثابت قدم رہنے کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ان کے تمام رفقاء کار نے وقتاً فوقتاً انہیں افغانستان کے معاملات میں ملوث ہونے سے روکنے کی کوشش کی۔سب ہی کو روس سے ڈر لگتا تھا لیکن جنرل ضیاء الحق کے لئے یہ مسئلہ صرف افغانستان کی آزادی ہی کا نہ تھا بلکہ پاکستان کا مستقبل، اس کی بقاء اور اور تحفظ بھی، ان کی رائے میں، افغانستان کی جدوجہد آزادی سے اس حد تک وابستہ تھے کہ وہ اس کو ایک تماش بین کی حیثیت سے دیکھتے رہنے کے لئے قطعاً تیار نہ تھے۔افغانستان کے مسئلے کے حل میں انہیں نہ صرف پاکستان کے تحفظ اور اس کے درخشندہ مستقبل کے انتہائی امید افزا خدوخال نظر آتے تھے بلکہ جمال الدین افغانی کے خوابوں کی تعبیر بھی حقیقت کا روپ دھارتی نظر آتی تھی۔انہیں کشمیر کے مسئلے کا حل بھی اس سے وابستہ نظر آتا تھا۔جنرل ضیاء الحق نے جس جرات اور دوراندیشی کا مظاہرہ افغانستان کے مسئلے

کے حل میں کیا، اس پر افغانستان کے مجاہدین آج بھی ان کو انتہائی عزت و احترام کے جذبے سے یاد کرتے ہیں۔

جنرل ضیاء الحق کی تصویر مکمل نہ ہوگی اگر ان کی کچھ اور خصوصیات کا ذکر نہ کیا جائے۔ شہید ضیاء الحق نے تمام تر اختیار ہونے کے باوجود دولت یا جائیداد کے حصول میں کبھی کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ وہ انتہائی درجہ کے دیانت دار تھے اور اسی لئے انہوں نے اپنے دور صدارت میں حتی المقدور کبھی کوئی ایسی بات نہ ہونے دی، جس سے ان کی نیت، ان کی دیانت اور ان کی پاک بازی پر ذرہ برابر بھی شک کیا جا سکتا تھا۔ اس پر وہ تو اس حد تک محتاط تھے کہ انہوں نے اپنے دور صدارت میں ایوان صدر میں رہنے سے بھی گریز کیا اور آرمی ہاؤس ہی میں رہنے کو ترجیح دی۔

جنرل ضیاء الحق فطرتاً نہایت ہی گھریلو قسم کے انسان تھے۔ جہاں ایک طرف وہ انتہائی شفیق باپ تھے تو دوسری طرف نہایت محبت کرنے والے شوہر اور اپنی والدہ کے نہایت ہی تابعدار بیٹے بھی تھے۔ اپنے عزیز و اقارب سے میل جول میں کبھی کوتاہی نہیں ہونے دیتے تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے اپنے کسی عزیز کو کوئی ایسا درجہ دلانے کی کوشش نہ کی جس کا وہ مستحق نہ تھا۔

اپنی سب سے چھوٹی بیٹی زین سے والہانہ محبت کرتے تھے۔ اس کی جزوی معذوریت کے باوجود وہ کبھی بھی اپنے خالق کے روبرو حرف شکایت زبان پر نہ لاتے۔ گھر میں اہم سے اہم میٹنگ ہو رہی ہو یا کوئی سربراہ حکومت ملنے آیا ہو، زین کو ہر وقت ڈرائنگ روم میں آنے کی اجازت تھی۔ ہر ایک سے اس کا تعارف کراتے اور ہمیشہ یہ کوشش کرتے کہ اس کو اس کی معذوریت کا ذرا بھی احساس نہ ہو۔ شاید انہی حالات نے ان کے دل میں ملک کے تمام معذوروں کے لئے ایک نرم گوشہ پیدا کر دیا تھا۔ ان سے پہلے اور ان کے بعد بھی کسی سربراہ

حکومت نے معذوروں کے لئے وہ کچھ نہیں کیا، جو صدر ضیاء الحق کر گئے۔

نہ صرف یہ کہ انہوں نے ان کے لئے خصوصی تعلیم کی سہولتیں بہم پہنچانے کا انتظام کیا بلکہ ان کے لئے نجی اور سرکاری اداروں میں نوکریوں کا کوٹہ بھی مقرر کروایا۔ انہوں نے ملک کے معذوروں کو جینے اور زندگی کی دوڑ میں بھرپور حصہ لینے کا جذبہ دیا۔ یہی نہیں ناداروں، بیواؤں اور حاجت مندوں کے لئے بھی صدر ضیاء الحق کی امداد ایسی ایسی جگہ پہنچتی تھی، جس کا دوسرے تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔ گھر کے نوکروں کے بچوں کی شادی بیاہ میں ضرور شریک ہوتے اور ایسے موقعوں پر حتی المقدوران کی مدد بھی کرتے تھے۔ وہ طبیعتاً رحم دل تھے اور ہمیشہ یہی کوشش کرتے کہ ان سے کسی کا دل نہ دکھے۔ جنرل ضیاء الحق بڑے ہی فراخ دل انسان تھے۔ مسٹر جونیجو کو وزیراعظم منتخب ہوئے کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ انہوں نے صدر کے سامنے 14 اگست کو مینار پاکستان سے قوم کو خطاب کرنے کا عندیہ ظاہر کیا۔ صدر ضیاء الحق نے پوچھا کہ اگر آپ قوم سے خطاب کرنا چاہتے ہیں تو آپ کے پاس کہنے کے لئے کوئی خاص بات تو ہونا چاہئے۔

وزیراعظم کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا لیکن اس کے باوجود وہ قوم سے خطاب پر مصر تھے۔ صدر نے ان کے اصرار پر آخر کار ان سے کہا کہ اگر خطاب کرنا ہی ہے تو ''سال کے اختتام پر مارشل لاء کے اٹھ جانے کا اعلان کر دیجئے''۔

یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ قائداعظمؒ اور شہید ملت کے بعد اگر پاکستان کو کوئی ایمان کا پختہ اور سیرت و کردار کا صاف ستھرا سربراہ مملکت ملا تو وہ جنرل ضیاء الحق ہی تھے ورنہ اس بدنصیب ملک کی سربراہی میں کس کس نے کیا کیا گل نہ کھلائے۔ صدر ضیاء الحق پاکستان کے لئے جیئے اور پاکستان ہی کے لئے شہید ہو گئے۔ اللہ رب العزت ان پر اپنی تمام تر رحمتیں نازل فرمائے۔

آمین

ضیاءالحق بحیثیت سپاہی

جنرل خالد محمود عارف

یہ سسکیاں بھرتے، اشکبار اور صدمے سے نڈھال انسانوں کا ایک سمندر تھا۔ یہ ہر اعتبار سے عظیم جنازہ تھا۔ مارگلہ کی پہاڑیوں کے دامن میں اسلام آباد کی نوتعمیر فیصل مسجد کے وسیع احاطہ میں دس لاکھ سے زائد پاکستانیوں نے صدر جنرل محمد ضیاءالحق کی آخری رسومات میں شرکت کی۔ ان ماتم گساروں میں افغان مہاجرین کی ایک کثیر تعداد بھی شامل تھی جن کی سوویت یونین کی جارحیت کے خلاف نو سالہ جدوجہد میں مرحوم نے غیر متزلزل اعانت کی تھی۔ لاکھوں پاکستانیوں نے جنازہ کا منظر ٹیلی ویژن پر براہ راست دیکھا یا ریڈیو سے اس پر رواں تبصرہ سنا۔

19 اگست کو (جس دن صدر ضیاءالحق کی تدفین ہوئی) سخت گرمی اور حبس تھا۔ صدر ضیاء کا تابوت پاکستان کے سفید اور سبز ہلالی پرچم میں لپٹا ہوا ایک توپ پر رکھا گیا تھا اور پاکستان کی تینوں مسلح افواج کے چوٹی کے افسروں نے اپنے جلو میں لے رکھا تھا۔ تینوں افواج کے سربراہ بھی جنازے کے ہمراہ تھے۔ تابوت اس شان سے فیصل مسجد پہنچا۔ یہ صدر ضیاء کا اپنی آخری آرامگاہ کی طرف سفر تھا جو پورے فوجی اعزاز کے ساتھ سرانجام پایا۔ آخر میں تابوت کو کندھوں پر اٹھا کر قبر کے قریب رکھ دیا گیا۔ نماز جنازہ کے بعد 21 توپوں کی سلامی دی گئی۔ صدر غلام اسحاق خان 35 ملکوں کے نمائندوں، سابق رفقاء کار، احباب، متعلقین، ماتحتوں اور بعض ناقدین کی موجودگی میں ان کا جسد خاکی اس قبر میں اتارا گیا جسے اس فوج کے جوانوں کے ایک گروپ نے کھودا تھا۔ جس کی ضیاء نے زندگی میں کمان کی تھی۔ یہ رقت آمیز مناظر تھے۔ تینوں افواج کے ایک مشترکہ چاق و چوبند دستے نے تین مرتبہ اعزازی فائر کئے۔ اپنی چمکتی دمکتی روایتی

وردیوں میں ملبوس بگل بجانے والے ایک گروپ نے آخری ماتمی بگل بجایا۔ پھر قبر ان گلدستوں کے اندر چھپ گئی، جو ممتاز شخصیتوں کی طرف سے نذرانہ عقیدت کے طور پر چڑھائے گئے۔

ضیاء کا دور ختم ہوگیا۔ وفاقی کابینہ نے انہیں فیصل مسجد میں دفن کرنے کا اعزاز بخشا کیونکہ ان کے نزدیک یہ صدر ضیاء کی اسلام اور پاکستان میں اسلامی قوانین کے نفاذ کی قابل تحسین مساعی کا اعتراف تھا"۔ صدر ضیاء نے جن کی عمر وفات کے وقت 64 برس تھی، پاکستان میں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور صدر کی حیثیت سے گیارہ برس حکومت کی۔ فوج میں ان کی خدمات 44 سال پر محیط تھیں جن میں سے 12 برس وہ فوج کے اعلیٰ ترین پیشہ ورانہ اور نہایت مطلوب عہدے یعنی چیف آف سٹاف کے منصب پر متمکن رہے۔

17 اگست 1988ء صدر ضیاء کی حیات مستعار کا آخری دن تھا اور یہ دن انہوں نے اپنے فوجی نوعیت کے فرائض ادا کرتے ہوئے گزارا، کیونکہ اس روز انہوں نے امریکہ کے ساختہ M1 ABRAM ٹینک کی مشق دیکھنی تھی تاکہ پاکستانی افواج کے لئے اس کی موزونیت کا جائزہ لیا جاسکے۔ یہ مشقیں بہاولپور کے قریب صحرا میں ٹامیوالی کی ٹینک فائرنگ رینج میں منعقد ہوئیں۔ جن ممتاز لوگوں نے یہ مشقیں دیکھیں ان میں امریکی سفیر آرنلڈ رافیل جن کی عمر 45 برس تھی اور پاکستان میں فوجی مشن کے سربراہ، 49 سالہ بریگیڈئر جنرل ہربرٹ ولیم پاکستانی جرنیلوں کا ایک گروپ اور دیگر افسر شامل تھے۔ مشقیں ختم ہوئیں تو یہ سب شخصیتیں ہیلی کاپٹر سے بہاولپور واپس آئیں جہاں انہیں امریکی ساخت کے اس بدقسمت C-130 طیارہ میں سوار ہونا تھا جو ان کے انتظار میں کھڑا تھا اور جس میں صدر ضیاء اور ان کی پارٹی اسی صبح راولپنڈی سے آئے تھے۔

17 اگست 1988ء کو بعد دو پہر اہم ترین شخصیتوں کی پرواز نے جسے اصطلاحاً ''پاک ون'' کا نام دیا جاتا تھا۔ 31 مسافروں کو لے کر بہاولپور کے ہوائی اڈے کو چھوڑا۔ جہاز معمول کے مطابق کسی وقت کے بغیر نہایت آرام سے فضا میں بلند ہوا اور ابتدائی دو منٹ تیس سیکنڈ تک بلند ہوتا رہا۔ اس دوران پائلٹ کا رابطہ بہاولپور کے ہوائی اڈے کے کنٹرول سے مسلسل برقرار رہا۔ پھر قیامت ٹوٹ پڑی۔ مواصلاتی رابطہ اچانک منقطع ہو گیا۔ یہ ٹربو جہاز جو سلامتی اور قابل اعتماد ہونے کے لحاظ سے معروف ہے مزید دو منٹ فضا میں رہا۔ یہ پراسرار اور نامعلوم صورت حال کے حامل 120 سیکنڈ جہاز کے انتہائی تجربہ کار عملے اور صدر اور ان کے ساتھیوں کے لئے اذیت ناک رہے ہوں گے۔ کچھ عینی شاہدوں نے اس جہاز کا عجیب وغریب انداز دیکھا کہ وہ ایک ننھے کھلونے کی طرح اوپر نیچے جھٹکے کھا رہا ہے اور بالآخر نہایت تیز رفتاری سے نوک کے بل ریتلی زمین میں دھنس گیا۔ جہاز اتنی قوت سے زمین سے ٹکرایا کہ اس کے انجن زمین میں 20 فٹ تک دھنس گئے۔ جہاز کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے جنہوں نے فوراً آگ پکڑ لی اور آگ کے ایک بہت بڑے گولے نے گردو پیش کے علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس حادثہ میں کسی کی جان سلامت نہ رہی۔ بعد میں انسانی جسموں کے جلے ہوئے مسخ اعضاء لاکھوں ٹکڑوں میں جمع کئے جاسکے اور نعشوں کی شناخت میں سخت دشواری پیش آئی۔ 31 افراد موت کی بھینٹ چڑھ گئے جن میں صدر پاکستان، 5 جرنیل اور دو امریکی شہری شامل تھے۔ صدر ضیاء نے دفاع پاکستان کے سلسلے میں اپنے فرائض ادا کرتے ہوئے وردی میں جام شہادت نوش کیا۔ اس شہادت نے ان کا مرتبہ عام فانی انسان کے مقام سے بہت بلند کر دیا۔

صدر ضیاء زندگی میں بھی بہت خوش قسمت تھے انہوں نے اپنی زندگی کی ابتدا نہایت معمولی حالات سے کی لیکن اپنے منتخب پیشے میں اپنی ثابت شدہ کارکردگی کی بنا پر وہ اعلیٰ ترین عہدے

تک پہنچے۔ انہوں نے اپنی زندگی کی تعمیر خود اپنے ہاتھوں سے کی۔ فوج میں ان کے تعلقات کمشن حاصل کرنے سے پہلے کسی سے بھی نہ تھے۔ ان کی تمام تر کارگزاری ان کی پیشہ ورانہ صلاحیت میں مضمر تھی۔ حالات نے کچھ ایسی کروٹ بدلی کہ وہ واحد شخص تھے جو بارہ برس تک چیف آف سٹاف کے عہدے پر متمکن رہے اور اپنی شہادت کے وقت اسی منصب پر فائز تھے۔

اگر جذبات سے عاری ہو کر خالص منطقی انداز سے سوچا جائے تو ضیاء اپنی موت کے معاملہ میں بھی خوش نصیب نکلے۔ انہوں نے اس دنیا سے اس وقت منہ موڑا جب وہ طاقت اور اختیارات کے درجہ کمال پر تھے۔ اپنے پیروکاروں اور مداحوں میں ان کی مقبولیت کا پیمانہ نکتہ عروج پر پہنچا ہوا تھا۔ انہوں نے پاکستان کو ایک سمت اور منزل عطا کر دی تھی۔ یہی ان کی زندگی کا مقصد بھی رہا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے مخالفین بھی کم نہ تھے اور ان کی زندگی میں ان مخالفین کا برسر اقتدار آنا ان کے لئے انتہائی ناخوشگوار ہوتا۔

مختلف لوگ ضیاء کو اپنے اپنے انداز میں یاد رکھیں گے۔ وہ ایک محبت کرنے والے اور مشفق باپ تھے۔ مذہبی طور پر ایک پرجوش شخصیت تھے۔ مسلم قومیت کے فدائی تھے۔ ایسے سیاستدان تھے جن کے بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ انہائی محبّ وطن پاکستانی تھے۔ ان سے گفتگو کرنے میں لطف آتا تھا۔ ایک قابل اعتماد پرسکون اور منکسر المزاج انسان تھے۔ ان کا کام کرنے کا اپنا ذاتی انداز تھا۔ افغان مجاہدین کے انتہائی مضبوط مددگار تھے۔ پاکستان کی جوہری توانائی کے پروگرام کے معمار تھے۔ وہ ایک سپاہی تھے جو سیاست کے داؤ پیچ کے ماہر سیاستدان کے روپ میں ڈھل گیا تھا۔ وہ ایک ایسے نظریاتی انسان تھے جو معاملات میں تکمیل اور اعلیٰ معیار کا خواہاں ہوتا ہے۔ ان کے پس ماندگان میں مداح بھی ہیں اور ان کے نقاد بھی۔ ہم لوگ ان کی وفات کے فوراً بعد کے دور میں ان کے کارناموں کا کوئی معروضی جائزہ لینے کے اہل نہیں ہیں

لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ وہ پاکستان کی تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں اور ان کے دور کو نہ بھلایا جا سکتا ہے نہ مٹایا جا سکتا ہے۔ آنے والے وقت میں اس کے بارے میں بحث و تمحیص اور نقد و نظر کا سلسلہ جاری رہے گا۔

سر دست مجھے بحیثیت سپاہی کے ان کی کارگزاری کے بارے میں کچھ معروضات پیش کرنا ہیں۔ ضیاء الحق 12 اگست 1924ء کو بھارتی پنجاب کے شہر جالندھر کے ایک غیر فوجی متوسط اور دیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد ان کے والد نے انہیں سینٹ سٹیفن کالج دہلی میں داخل کرنے کا انتظام کیا۔ صدر ضیاء نہایت اشتیاق سے کالج میں گزرے دنوں کو یاد کیا کرتے تھے۔ جنہوں نے ان کی شخصیت کو بلوغت تک پہنچنے کے دور میں نکھار بخشا۔ کالج میں بھی نوعمر ضیاء مذہبی شعائر کی پابندی کرتے تھے اور باقاعدہ نماز ادا کرتے تھے۔

دوسری جنگ عظیم نے ضیاء کے دل میں فوج میں شرکت کا اشتیاق ابھارا۔ اس وقت وہ فورتھ ایئر میں زیر تعلیم تھے۔ ''آفیسرز ٹریننگ سکول'' میں تربیت مکمل کرنے کے بعد ضیاء کو 12 مئی 1945ء کو کمشن ملا اور انہیں برما کے محاذ پر 13 لانسرز میں تعینات کیا گیا۔

سیکنڈ لیفٹیننٹ ضیاء کو جلد ہی ایک ناخوشگوار صورتحال کا سامنا کرنا پڑا۔ ہوا یہ کہ عید کے دن دیسی لباس پہن کر جونیئر کمشنڈ افسروں سے ملنے ان کے میس میں چلے گئے ان دنوں روایتی طور پر ہندوستانی افسروں کو اپنے گھروں سے باہر لازماً مغربی لباس پہننا پڑتا تھا۔ چھٹی کے دن بھی ضیاء کا دیسی لباس زیب تن کرنا ایک ایسی غیر افسرانہ حرکت تھی جو صرف نظر نہیں کی جا سکتی تھی۔ ان کے انگریز کمانڈنٹ افسر کے نزدیک ایک نوجوان افسر کا یہ عمل ناقابل قبول تھا۔ چنانچہ تنبیہ کے طور پر ضیاء کو ایک دوسری یونٹ..... 6 لانسرز میں تبدیل کر دیا گیا۔ دوسری جنگ عظیم کے اختتام تک ضیاء نے ملایا اور جاوا کے محاذوں پر خدمات سرانجام دیں۔ جب جاپان نے ہتھیار

ڈال دیئے تو ہندوستانی افواج وطن واپس لوٹ آئیں۔ لیفٹننٹ ضیاء کو آرمرڈ کور سنٹر میں ٹیکنیکل ٹریننگ ونگ میں تعینات کیا گیا۔

دوسری جنگ عظیم میں شکست کھانے کے بعد محوری طاقتیں تو اپنے زخم چاٹ ہی رہی تھیں فاتح اتحادیوں کی حالت بھی کچھ اچھی نہ تھی۔ امریکہ کو چھوڑ کر باقی تمام ریاستوں کی معیشت کا برا حال تھا۔ جنگ کے سیاسی اثرات بھی مرتب ہو گئے تھے۔ افریقہ اور ایشیا کی نو آبادیوں میں سیاسی بیداری کی لہر دوڑ گئی تھی۔ برطانیہ عظمٰی کے لئے ہندوستان کو اپنے سامراجی تسلط میں رکھنا اب ممکن نہ رہا تھا۔ اس ناگزیر صورتحال کے پیش نظر برصغیر سے یونین جیک کی بالادستی ختم ہو گئی اور بھارت اور پاکستان کی آزاد ریاستوں کا قیام عمل میں آگیا۔ ضیاء نے ملازمت کے سلسلے میں پاکستان کا انتخاب کیا۔ ضیاء کا خاندان دنیوی مال و اسباب سے محروم ہو کر پاکستان کی محفوظ سرزمین میں منتقل ہو گیا جب کہ پورا برصغیر ہوش و خرد سے عاری ہو کر تباہ کن فرقہ وارانہ فسادات کی لپیٹ میں آگیا، جن میں لاکھوں افراد مارے گئے اور اس سے زیادہ تعداد کو گھر بار چھوڑنا پڑا۔ ضیاء نئے ملک کی افواج میں شمولیت کے لئے آرمرڈ کور کے کچھ اور افراد کے ساتھ بذریعہ ٹرین نوشہرہ پہنچے۔ یہ ایک طویل اور پر خطر سفر تھا۔ راستے میں متعصب ہندو بلوائیوں نے کئی بار ٹرین پر گولیاں چلائیں۔ پاکستان پہنچنے پر کپتان ضیاء کو آرمرڈ کور سنٹر میں تعینات کیا گیا جو نیا نیا قائم کیا گیا تھا یہاں انہوں نے چراٹ کے مقام پر بوائز ونگ کی کمان سنبھالی۔ یہاں انہوں نے ان نوجوان لڑکوں میں قیادت کی خوبیاں ابھارنے کے لئے ان کے عہدہ داروں کو مختلف انتظامی ذمہ داریاں سپرد کیں۔ انہوں نے ایک نیا طریق کار متعارف کرایا جس کے تحت پہلی پریڈ کا آغاز زیر تربیت ریکروٹوں میں سے کوئی ایک تلاوت قرآن سے کرتا تھا۔ ستمبر میں 1950ء میں ضیاء یہاں سے تبدیل ہوئے تو آرمرڈ کور سنٹر پاکستانی فوج کی چھ آرمرڈ رجمنٹوں

کی ضروریات کی تکمیل کے لئے ایک نہایت معقول تربیتی ادارے کی شکل اختیار کر چکا تھا۔

10 اگست 1950ء کو ضیاء کی شادی لاہور میں اپنی عم زاد شفیقہ سے سرانجام پائی۔ شادی کی تقریب سادہ اور نجی نوعیت کی تھی، جس میں ان کے اعزاء کے علاوہ چند قریبی دوست شریک ہوئے۔ اس جوڑے میں ایک نا قابل رشک ذہنی ہم آہنگی پیدا ہوئی جس کے نتیجے میں ان کی رفاقت کا جذبہ جلد مستحکم ہو گیا اور وہ آخر تک قائم رہا۔ ان کے ہاں پانچ بچوں نے جنم لیا جن میں دو لڑکے اور تین لڑکیاں شامل تھیں۔ سب سے چھوٹی بچی، زین جو معذور تھی اپنے شفیق باپ کی آنکھ کا تارا تھی۔ اسے پروٹوکول کی پابندیوں سے ماورا، صدر کے دفتر اور بعض روایتی تقریبات میں بھی رسائی حاصل تھی۔ بعض اوقات جب ضیاء اپنے ملاقاتیوں سے غیر رسمی ملاقات کر رہے ہوتے تو وہ اپنے بعض ذاتی مسائل جو اس کے نزدیک اہم نوعیت کے ہوتے تھے، صدر کی توجہ حاصل کرنے کے لئے ان کے ڈرائنگ روم میں در آتی۔ زین نے جسے سماعت اور گویائی دونوں میں مشکل کا سامنا تھا، اپنے محبت کرنے والے اور شفیق باپ کی موت پر غیر معمولی حوصلہ کا ثبوت دیا۔

ضیاء ستمبر 1950ء میں گائیڈز کیولری میں تعینات ہو گئے۔ یہ رجمنٹ جاسوسی کے فرائض سرانجام دیتی تھی اور اس میں ہلکے ٹینک اور آرمرڈ کاریں شامل تھیں۔ انہیں پہلے پہل رجمنٹ کا کوارٹر ماسٹر مقرر کیا گیا۔ اس ذمہ داری کے پیش نظر انہیں رجمنٹ کے گولہ بارود کی نگرانی کرنی پڑتی تھی۔ اس خوفناک سازوسامان کی دیکھ بھال اور حساب کتاب کے معاملے میں وہ اپنے ماتحوں پر پورا اعتماد کرتے تھے اور وہ ہمیشہ اس اعتماد پر پورے اترے۔ اس یونٹ میں انہوں نے دس سال تک خدمات سرانجام دیں اور یہیں کئی ساتھی افسروں سے ان کی عمر بھر قائم رہنے والی دوستیاں استوار ہوئیں۔ ان میں سے پیر عبداللہ شاہ، ہاشم علی خان، عباس درانی، علی امام، فضل

حق اور امیر گلستان جنجوعہ نے ریٹائرمنٹ کے بعد بھی ان کے ساتھ تعلقات برقرار رکھے۔ یہ پرانا گروپ اکثر ملتا رہتا تھا اور ان ملاقاتوں میں گزرے دور کو یاد کیا جاتا۔ جی بھر کے قہقہے لگائے جاتے اور پھر ملنے کے لئے گروپ منتشر ہو جاتا۔ ضیاء اگرچہ دنیوی مراتب میں کہیں آگے جا چکے تھے لیکن دوستوں سے مساوی سطح پر ملتے اور ان کی محفلوں میں شریک ہوتے۔ یہ لوگ اپنی جگہ ان کا مناسب احترام برقرار رکھتے۔

ضیاء نے 1955ء میں بین الاقوامی شہرت یافتہ کمانڈ اینڈ سٹاف کالج کوئٹہ کا وقت طلب کورس بآسانی پاس کرلیا۔ ضیاء کی ایک بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ وقت کی پابندی نہیں کر پاتے تھے اور یہ کمزوری ان کی فوجی زندگی میں نمایاں تھی۔ پھر وہ رسالے کے چند اور نوجوان افسروں کی طرح رنگین جرابیں پہننے کے شوقین تھے۔ ان دونوں کمزوریوں نے ان کے لئے ایک مرتبہ ایک عجیب منظر پیدا کر دیا۔ ہوا یوں کہ ضیاء پہلی پریڈ میں پانچ منٹ دیر سے پہنچے جس میں ایک سنٹر ماڈل پر بحث ہونا تھی اور کورس کے سارے افسر موجود تھے۔ وہ خاموشی سے کمرے میں داخل ہوئے۔ دیر سے آنے پر معذرت کی اور خاموشی سے سیڑھیاں چڑھ کر آخری قطار میں اپنی متعینہ نشست پر بیٹھ گئے۔ نہایت خاموش فضا میں 160 افسروں کی نگاہوں نے ضیاء کی تاخیر کا نوٹس لیا۔ اس ماڈل پر بحث کے انسٹرکٹر عتیق الرحمان تھے جو اس طرح فروگذاشت کو نظر انداز کر دینے والے نہ تھے۔ انہوں نے جذبات سے عاری چہرے سے ضیاء کی طرف دیکھا اور بڑی نرمی سے ضیاء کو حکم دیا کہ وہ کھڑے ہو جائیں اور اپنی پتلون کے پائنچے اوپر اٹھائیں۔ ضیاء نے نہایت شرمندگی سے حکم کی تعمیل کی۔ عتیق الرحمان نے ایک زوردار قہقہہ بلند کیا ''ضیاء بہت شکریہ تمہاری جرابیں بہت خوب ہیں تشریف رکھیے''۔

سٹاف کورس میں ضیاء کی کارکردگی اتنی عمدہ تھی کہ اس بنیاد پر ان کی بقیہ فوجی زندگی میں انہیں

کئی ایسے فرائض تفویض کیۓ گئے جن پر کسی بھی پیشہ ور فوجی افسر کو رشک آسکتا تھا۔ وہ 1956ء سے 1967ء تک 3 آرمرڈ بریگیڈ کے بریگیڈ میجر رہے۔ ملٹری آپریشن ڈائریکوریٹ میں 1960ء سے 1963ء تک جنرل سٹاف آفیسر رہے۔ پھر 1967ء سے 1969ء تک آرمرڈ ڈویژن میں کرنل کے عہدے کے مساوی جنرل سٹاف آفیسر رہے۔ اس اثناء میں 1963ء سے 1965ء تک وہ کمانڈ اینڈ سٹاف کالج کوئٹہ میں انسٹرکٹر رہے۔ جو فوج میں ایک ممتاز اور گراں قدر فریضہ کہا جاتا ہے۔ 1965ء میں پاک بھارت جنگ چھڑ جانے کی وجہ سے وہ یہاں معمول کے مطابق تین سال تک فرائض سرانجام نہ دے سکے۔ اس کے بعد انہیں ایک نئے قائم کردہ انفنٹری ڈویژن کے اسسٹنٹ ایڈ جوٹنٹ اور کوارٹر ماسٹر کے فرائض سپرد کیۓ گئے۔ انہوں نے امریکہ سے بھی دو کورسوں کی تکمیل کی جس میں 1963ء کا ایسوسی ایٹ کمانڈ اینڈ سٹاف آفیسرز کورس شامل ہے۔ مختلف عہدوں پر کام کے دوران ضیاء کو ایک نہایت محتاط اور باریک بین افسر سمجھا جاتا تھا۔ وہ کسی رپورٹ کو تاخیر سے پیش کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے تھے لیکن جب تک اس کے معیار اور مندرجات کی عمدگی کے بارے میں انہیں اطمینان نہ ہو جاتا وہ اسے پیش نہ کرتے۔

نومبر 1985ء میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جو زندگی کے بارے میں ضیاء کے رویۓ پر روشنی ڈالتا ہے۔ ضیاء بریگیڈیر جنجوعہ کے ساتھ جو اس وقت میجر تھے، ایک فوجی گاڑی میں راولپنڈی سے کھاریاں جا رہے تھے، اس گاڑی کو ایک فوجی ڈرائیور چلا رہا تھا۔ جہلم کے نزدیک اس گاڑی کو ایک حادثہ پیش آیا اور ایک سویلین کی ٹانگ زخمی ہوگئی۔ ضیاء زخمی کو ہسپتال لے گئے۔ علاج کے دوران اس کی مزاج پرسی کے لئے گئے اور اسے تحفے تحائف بھی پیش کیۓ بدقسمتی سے یہ شخص بہت لالچی ثابت ہوا۔ اس نے عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا کہ جس گاڑی سے ٹکرا کر وہ

زخمی ہوا تھا اسے میجر جنجوعہ چلا رہے تھے اور حادثہ ان کی لاپرواہی کی وجہ سے پیش آیا۔

اس مقدمہ کی کارروائی کے دوران ضیاء صفائی کے گواہ کے طور پر پیش ہوئے اور بیان دیا کہ جنجوعہ گاڑی میں سفر کر رہے تھے اور ڈرائیور کوئی اور تھا۔ لیکن انہوں نے اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ یہ اضافہ کیا کہ ''گاڑی میں سوار فوجی افسروں میں سب سے سینئر میں تھا اور میری رائے میں حادثہ پیش آنے میں ڈرائیور کا کوئی قصور نہ تھا''۔ تاہم جو کچھ بھی ہوا سب سے سینئر ہونے کی وجہ سے میں اس کی پوری ذمہ داری قبول کرتا ہوں۔ جنجوعہ اب تک اس پورے واقعہ کو تحسین اور احسان کے جذبے کے تحت ماضی کی ایک خوشگوار یاد سمجھتے ہیں۔

پاکستانی فوج میں روایتاً ہر افسر اس یونٹ کی کمان حاصل کرنے کی تمنا رکھتا ہے جس میں اس نے خدمات سرانجام دی ہوں۔ حالات کی ستم ظریفی سے ضیاء اس مسرت سے محروم ہو گئے۔ میجر جنرل گل حسن فوج میں ایک سخت گیر منتظم تھے۔ وہ اپنے ماتحت ایک یونٹ کی کارکردگی سے غیر مطمئن تھے اور اس کے کمانڈنگ افسر کو بدلنا چاہتے تھے۔ ضیاء اس زمانے میں اس کے سٹاف افسر تھے۔ جنرل گل حسن نے انہیں حکم دیا کہ وہ 22 نمبر رسالے کی کمان سنبھال لیں۔ ضیاء نے چیلنج بڑی خوشدلی سے قبول کر لیا اور اپنی انتھک محنت سے صرف اٹھارہ ماہ میں اس رجمنٹ کو پیشہ ورانہ کارکردگی کے اعتبار سے ایک بلند معیار پر پہنچا دیا۔ ان کے اس کارنامے کی وجہ سے پورے ڈویژن میں ان کو سراہا گیا اور ان کے وقار میں اضافہ ہوا۔ ضیاء بھی 22 نمبر رسالے سے خصوصی لگاؤ رکھتے تھے اور انہوں نے اس سے باقاعدہ رابطہ برقرار رکھا۔ رسالے کے سپاہی اور جوان تو ضیاء کے شیدائی بن گئے۔

ضیاء مئی 1969ء میں بریگیڈیئر بنا دیئے گئے اور انہوں نے کھاریاں میں 9 آرمرڈ بریگیڈ کی کمان سنبھال لی۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد اکتوبر میں انہیں ڈیپوٹیشن پر اردن بھیج دیا گیا

جہاں انہوں نے دوسال تک خدمات سرانجام دیں۔

1972ء سے 1975ء تک تین سال ضیاء نے اس آرمرڈ ڈویژن کی قیادت کی۔ ان کا انداز قیادت ذاتی اور بلاواسطہ اور اکثر لگی بندھی روایات سے ہٹا ہوا ہوتا تھا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ فوجی مسائل پر ان کی جو باقاعدہ میٹنگز ڈویژن کے ہیڈکوارٹر میں منعقد ہوتی تھیں ان کے سٹاف افسروں کے علاوہ بریگیڈئر اور یونٹ کمانڈر بھی بلاناغہ شریک ہوتے تھے۔

جب کہ معمول کے مطابق یہ افسر عام میٹنگز میں نہیں آتے جن کی صدارت ڈویژن کا کمانڈر کر رہا ہو۔ یہ میٹنگز شاید و باید ہی چھ گھنٹے سے کم دورانیہ کی ہوتی تھیں۔ ان میٹنگز کا ماحول بڑی بے تکلفی کا ہوتا تھا اور شرکاء کو اظہار رائے کی آزادی تھی۔ ضیاء کی عادت تھی کہ وہ بڑے تفصیلی نوٹ لیتے تھے اور میٹنگز کے آخر میں جب کارروائی سمیٹتے تو کبھی مختصر گفتگو نہ کرتے۔

آرمرڈ ڈویژن میں ایک انتہائی سرگرم تربیتی پروگرام رائج ہوگیا جس میں ہر سطح کے کمانڈر ذاتی دلچسپی لیتے۔ ضیاء کو تقریباً تمام افسروں کے نام حفظ تھے۔ وہ بذات خود ہر سال اپنی ماتحت افواج میں ایک ایسی تربیتی مشق میں ضرور شرکت کرتے جس میں سکواڈرن اور کمپنی کی سطح کے کمانڈر شریک ہوتے۔ ہر مشق کے بعد اس کا گہرا تجزیہ کیا جاتا اور تنقیدی جائزہ لیا جاتا۔ اس سے اوپر کی سطح پر ہر یونٹ اور بریگیڈئر سال میں ایک عرصہ لازماً اپنے سپاہیوں کے ساتھ مشق میں سے گزارا جاتا۔ ڈویژنل ہیڈکوارٹر سال میں دو مرتبہ سگنل کی مشقوں میں شرکت کرتا۔ ان مشقوں میں ضیاء ریڈیو سے رابطے کے طے شدہ طریق کار کے برعکس اپنے کمانڈروں سے براہ راست مخاطب ہوتے تھے مثلاً ضیاء کی طرف سے عارف کے لئے وغیرہ۔

ضیاء ہر شخص کی بات نہایت تحمل اور غور سے سنتے۔ بالعموم وہ اپنا پروقار انداز برقرار رکھتے۔ اچھی کارکردگی کی تعریف کرتے لیکن غلطیوں پر گرفت سے گریز نہ کرتے۔ اپنے سپاہیوں کی

تربیت اوران کی فلاح و بہبود کو وہ اولیت دیتے۔ وہ ان کے لئے بڑی فراخ دلی سے عطیات دیتے اوران کے وقار اور افتخار میں اضافے کے لئے ہرممکن قدم اٹھاتے۔ ماتحت افواج بھی ان کے احکامات کی تکمیل خوشدلی سے کرتی تھیں اوران کی سادگی، بے تکلفی اور قیادت کی خوبیوں کی وجہ سے بہت عزت کرتی تھیں۔ اگر مشقوں کے دوران کوئی حادثہ رونما ہوجاتا تو وہ سب سے پہلے لوگوں کی خیریت کے بارے میں دریافت کرتے۔ سازوسامان یا گاڑیوں کا نقصان ان کے لئے دوسرے درجے پر آتا تھا۔

ضیاء روحانی تربیت کو برابر کی اہمیت دیتے تھے۔ وہ جب کبھی افسروں یا سپاہیوں سے خطاب کرتے ان کی تقریر قرآن پاک کے حوالوں سے مزین ہوتی۔ چیف آف آرمی سٹاف کی حیثیت سے انھوں نے فوج کے ایک دستے کو ہر سال حج پر بھیجنے کا سسٹم رائج کیا۔ یہ دستہ سڑک کے راستے سفر کرتا اور یہ سلسلہ بہت مقبول ہوا۔ وہ فوجی افسروں کی بیرونی سفر پر جاتے ہوئے یا فرائض کی انجام دہی کے بعد واپسی پر عمرے کی سعادت حاصل کرنے کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔

عمر کے ابتدائی حصے میں ضیاء بہت جلد جذبات میں آنے والے اور چڑ جانے والے شخص تھے۔ غلط کاموں کے بارے میں وہ بہت زود حس تھے اور غصہ پر قابو نہ رکھ سکتے تھے۔ غصہ اتارنے کے لئے وہ فوج کی ناقابل تحریر مغلظات سے بھی گریز نہ کرتے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان کے مزاج میں تبدیلی رونما ہوگئی۔ تجربے اور ذمہ داریوں میں اضافے نے ان کے مزاج میں دھیما پن پیدا کردیا۔ وہ بڑے انکسار سے یہ ذکر کرتے تھے کہ ''میں جب خانہ خدا میں حاضری دیتا ہوں تو دل سے دعا کرتا ہوں کہ میں کسی کا دل نہ دکھاؤں'' البتہ وہ اس بات کا اظہار نہیں کرتے تھے کہ وہ ان مواقع پر کس طرح زاروقطار رویا کرتے تھے۔

ان کا ظاہر بہت پرسکون تھا لیکن ان کے پہلو میں ایک حساس دل تھا جو اپنے اہل خانہ کی محبت اور شفقت سے لبریز تھا، ضیاء کو اپنی بچیوں سے بہت محبت تھی۔ ان کے برادر نسبتی ڈاکٹر بشارت الٰہی اکثر یاد کرتے ہیں کہ کس طرح میجر جنرل ضیاء 1972ء میں اپنی بیٹی قرۃ العین (جسے پیار سے عینی کہتے تھے) سے ملنے کے لئے ملتان سے لاہور کا سفر کرتے رہتے تھے جہاں وہ لاہور کالج کے ہاسٹل میں مقیم تھی۔ ملاقات کے بعد باپ بیٹی مشکل سے جدا ہوتے تھے۔ ضیاء جب رخصت ہونے لگتے تو باپ بیٹی دونوں بمشکل جذبات پر قابو رکھ سکتے تھے۔ یعنی باپ سے لپٹ جاتی اور اس کے رخسار آنسوؤں سے تر ہو جاتے اور ضیاء بھی اپنی اشکبار آنکھوں کو رومال سے چھپانے کی ناکام کوشش کرتے۔

ضیاء ملتان میں تقریباً ایک سال تک دوسری کور کے کمانڈر رہے اور پھر مارچ 1972ء میں انہیں 4 ستاروں والے جرنیل کے عہدے پر ترقی دے کر پاکستان کی فوج کا چیف آف آرمی سٹاف بنا دیا گیا۔ ملتان مدینۃ الاولیاء کہلاتا ہے۔ جس میں بہت سے بزرگوں کے مزار ہیں۔ یہاں کا موسم سرما نسبتاً نرم ہوتا ہے جبکہ گرمیاں طویل اور شدید ہوتی ہیں۔ ضیاء موسم کے شدائد کے باوجود ملتان سے بہت محبت کرتے تھے۔ انہیں یہاں بزرگوں کے مزاروں پر حاضری دے کر اور وہاں دست دعا اٹھا کر بڑی طمانیت اور روحانی تسکین حاصل ہوتی تھی۔ اکثر راتوں کو وہ مراقبہ بھی کیا کرتے تھے۔

کسی افسر کے لئے اپنے ملک کی فوج کو کمانڈ کرنا اس کی پیشہ ورانہ انا کی تسکین کا نکتہ کمال ہوتا ہے۔ ضیاء کو یہ اعزاز حاصل ہوا۔ انہوں نے اس عہدے پر اپنے کام کا آغاز بڑے جوش و جذبے اور اچھوتے طریق کار سے کیا جو جنرل ہیڈ کوارٹر کی فضاء میں تازہ ہوا کا جھونکا ثابت ہوا۔ انہوں نے فوج کی پیشہ ورانہ صلاحیت کو ترقی دینے اور اس کی کارکردگی کے لئے ضروری

سازوسامان مہیا کرنے کے لئے کئی نئے اقدامات اٹھائے۔ان کے یہ عہدہ سنبھالنے کے ایک سال کے اندر پاکستان سیاسی انتشار کی وجہ سے مفلوج ہو کر رہ گیا کیونکہ ملک میں مارچ 1977ء کے انتخابات میں دھاندلی کے خلاف ایک زبردست تحریک اٹھ کھڑی ہوئی۔ملک میں جولائی 1977ء کو مارشل لاء نافذ کرنا پڑا جو دسمبر 1985ء تک جاری رہا۔ضیاء 17 اگست 1988ء تک یعنی فضائی حادثے میں افسوسناک شہادت تک فوج کے چیف کے عہدے پر فائز تھے۔اس اعتبار سے وہ پہلے پاکستانی تھے جو 12 سال سے زیادہ فوج کے چیف آف سٹاف رہے۔اس طویل عرصے میں پاکستان کی فوج میں دفاعی کارروائیوں، تربیت، انٹیلی جنس، انتظامی اموراورافراد کی دیکھ بھال، ہر شعبے میں تبدیلیاں رونما ہوئیں جن کا احاطہ اس مختصر تحریر میں ممکن نہیں۔

ضیاء اپنے ماتحتوں پر اعتماد کرنے والے افسر تھے جو کچھ انہیں بتایا جاتا مان لیتے جب تک یہ ثابت نہ ہو جاتا کہ اس میں کوئی غلط بیانی ہے۔اس وجہ سے وہ بعض اوقات مشکل میں بھی پڑ جاتے کیونکہ لوگ ان کے بھروسہ کرنے والی عادت سے ناجائز فائدہ اٹھاتے اور اپنا الوسیدھا کرنے کی کوشش کرتے۔یعنی غلط معلومات فراہم کر کے یا غلط بیانی سے اپنے مفاد میں احکامات حاصل کر لیتے۔ان سے اس طرح حاصل کردہ بعض فیصلوں کے بارے میں حقائق سامنے آ جانے پر ان پر خط تنسیخ پھیر دیا گیا۔لیکن بہت سے فیصلوں کے بارے میں کچھ پتہ نہ چل سکا۔لیکن ضیاء کو اگر یہ یقین ہو جاتا کہ انہوں نے غلط معلومات کی بنیاد پر کوئی حکم جاری کیا ہے تو وہ اسے بلا جھجک بدل دیتے۔

قدرت نے ضیاء کو مسلسل محنت کرنے کی بے پناہ صلاحیت سے نوازا تھا۔رات بھر جاگنے کے بعد بھی ان کے چہرے پر تھکن کے کوئی آثار ظاہر نہ ہوتے تھے۔انہوں نے کرسی پر بیٹھے

بیٹھے یا سفر کے دوران نیند پوری کرنے کی خاص صلاحیت حاصل کر لی تھی۔ طول وطویل بین الاقوامی ہوائی سفر کرنے کے بعد بھی وہ تروتازہ اور چاق وچوبند دکھائی دیتے اور میٹنگز کے طول و طویل سلسلوں میں شرکت کے لئے مستعد ہوتے۔ وہ پسند کرتے تھے کہ ان کے سامنے پیش کردہ تحریری رپورٹیں یا زبانی مشورے مربوط اور محنت سے تیار کردہ ہوں۔ وہ کتابیں، جرائد اور اخبارات تو بڑے شوق سے پڑھتے لیکن طویل دفتری نوعیت کی رپورٹیں اور فائلیں پڑھنے پر مشکل سے آمادہ ہوتے۔ اسی لئے ان کے دفتروں میں فائلوں کا کام وقت پر نہ ہو پاتا۔ تاج جو سترہ برس تک ان کے پرسنل سیکرٹری رہے ہیں اکثر ذکر کرتے ہیں کہ انہیں صاف ستھرے اور اغلاط سے مبرا ٹائپ کئے ہوئے خط بہت پسند تھے۔ وہ ہر تحریر کو لفظ بلفظ پوری احتیاط سے پڑھتے اور کبھی جلد بازی میں کسی خط پر دستخط نہ کرتے اگر کسی ڈرافٹ کو ٹائپ کرنے میں کوئی نقص رہ جاتا تو وہ کہا کرتے تھے ''بھئی ٹائپ کرتے ہوئے جاگتے رہا کرو'' ان کی یادداشت تیز تھی اور ان کی خواہش ہوتی تھی کہ انہیں ہر کام میں پیش رفت سے آگاہ رکھا جائے۔ انہوں نے ایک دفعہ تاج سے کسی تفویض کردہ کام کے بارے میں پوچھا۔ منفی جواب پانے پر انہوں نے بذلہ سنجی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہیں تنبیہہ کی ''مت بھولو کہ پنڈی کی جیل نئی تعمیر شدہ تو ہے لیکن کچھ ایسی آرام دہ بھی نہیں''۔

ضیاء باعمل لیکن وسیع النظر مسلمان تھے۔ مذہبی فرائض پابندی سے ادا کرتے، موسیقی اور فلموں سے لطف اندوز ہوتے، ٹینس، گالف اور سکواش کھیلتے۔ وہ دوسروں پر اپنے عقائد مسلط کرنے کے قائل نہ تھے۔ جوں جوں ان کی عمر بڑھتی گئی اپنے دین کی بین الاسلامی اہمیت پر ان کا یقین پختہ تر ہوتا گیا۔ صدر پاکستان کی حیثیت سے وہ اسے اپنی اخلاقی اور دینی ذمہ داری سمجھتے کہ مسلمانوں میں دین کا شعور بیدار کیا جائے۔ چیف آف آرمی سٹاف کی حیثیت سے

انہوں نے فارمیشن کمانڈرز کے نام ایک حکم نامے میں دینی کتابوں کی فہرست ارسال کی تا کہ فوج کے سپاہی اور افسران کا مطالعہ کریں اس طویل فہرست میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی کچھ کتابیں بھی شامل تھیں۔ چنانچہ بہت جلد ضیاء کو ذوالفقار علی بھٹو کے سامنے یہ وضاحت کرنی پڑی کہ ان کا تعلق مولانا مودودی کی جماعت سے نہیں تھا۔ یہ حقیقت سب کو معلوم ہے کہ بھٹو اور مولانا مودودی ایک دوسرے کے شدید مخالف تھے۔

شفیقہ اور ضیاء میاں بیوی کی حیثیت سے ایک دوسرے سے گہری وابستگی رکھتے تھے۔ ہر ایک کا مسکرا کر استقبال کرتے، انکسار ان کی طبیعت میں تھا اور مہمان نوازی ان کا شیوہ۔ اپنے ہاں مہمانوں کی پر تکلف تواضع کرتے حالانکہ شروع میں ان کی مالی حالت کچھ ایسی اچھی نہیں تھی۔ وہ آنے والے کا استقبال کچھ اس انداز سے کرتے کہ وہ جلد ہی بے تکلف ہو جاتا۔ ضیاء اگر گھر سے کہیں جاتے تو ہر شام اپنی رفیقہ حیات سے فون پر رابطہ ضرور کرتے اور اگر ملازمت کے حالات کی وجہ سے انہیں طویل عرصہ تک جدا رہنا پڑتا تو وہ گھر میں لمبے لمبے خطوط بھیجتے وہ ایک سچی مشرقی خاتون خانہ کی طرح ان خطوں کو سنبھال کر رکھتیں اور خلوت میں انہیں دوبارہ پڑھتیں۔ وہ اب ان کے لئے ایک بیش بہا خزانہ ہیں۔ شفیقہ ضیاء نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ مجھے اس مضمون میں پیش کرنے کے لئے چند خطوط منتخب کر کے دیں گی لیکن وہ اپنے جذبات پر قابو پا کر اپنے مرحوم خاوند کے تحریر کردہ خطوط کو دوبارہ پڑھ ہی نہیں سکیں کہ ان میں سے کچھ کو چن کر اشاعت کے لئے چھانٹ سکیں۔

ضیاء کو ورثہ میں بہت سے سینئر فوجی ماتحت افسر ملے تھے جنہوں نے بالعموم ان کے ساتھ نہایت وفاداری اور راست بازی سے تعاون کیا۔ جو بھی مسئلہ ان کے سامنے پیش ہوتا اس پر سیر حاصل بحث ہوتی اور لگی لپٹی رکھے بغیر جو رائے درست سمجھی جاتی بلا جھجک اور بے تکلف پیش کر

دی جاتی۔ چونکہ ضیاء کی حکومت بہت عرصہ تک رہی اس لئے انہیں بہت سے ایسے ساتھیوں سے محرومی کی قیمت ادا کرنی پڑی...... سینئر ساتھی ایک ایک کر کے ریٹائر ہوتے رہے اور نئے چہرے سامنے آنے لگے۔ چیف اور فارمیشن کمانڈرز کے درمیان فاصلے بڑھتے گئے۔ نئے افسر نہ تو اخلاص میں کم تھے نہ وابستگی میں لیکن ان کا مسئلہ یہ تھا کہ انہیں ملک کے انتظامی امور سے کوئی واسطہ نہ رہا تھا اور ان کے لئے ممکن نہ تھا کہ پاکستان کو درپیش متعدد پیچیدہ سیاسی اور انتظامی امور کے بارے میں براہ راست مشاہدے اور معلومات کی بنیاد پر کوئی سوچا سمجھا مشورہ دے سکیں۔ عمر کے آخری حصے میں ضیاء کو اپنے قریبی دوستوں کے حلقے کے مشوروں پر عمل کرنا پڑتا تھا جو اکثر ان کے مفادات کی چھلنی سے چھن کر ان تک پہنچتے تھے کیونکہ یہ لوگ اپنے ان مفادات کو اولیت دیتے تھے۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو جن عہدوں پر متمکن تھے ان کے تقاضوں کو پورا کرنے کی اہلیت سے ہی بہرہ ور نہ تھے۔

اپنی شہادت سے صرف تین ہفتے پہلے ضیاء نے راقم کو بتایا کہ ان کے کچھ بااعتماد ساتھیوں نے ان کے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ لیکن افسوس کہ ضیاء کو یہ احساس بہت تاخیر سے ہوا۔ ضیاء کے قریبی دوستوں کو یاد ہے کہ ان کے ایک ہم عصر فوجی افسر نے ایک طرح ضیاء کو نقصان پہنچایا تھا۔ لیکن صدر بننے کے بعد ضیاء نے انہیں ایک منافع بخش عہدہ پر فائز کر دیا۔

ضیاء کے طیارے کے حادثے کی پشت پر کون تھا؟ یہ سوال اب تک جواب طلب ہے۔ حادثہ کے فوراً بعد صدر اسحاق خان کی انتظامیہ نے بورڈ آف انکوائری تشکیل دیا تھا تا کہ حادثہ کی فنی وجوہات کی تحقیق ہو سکے۔ اس بورڈ کی اعانت ہوائی حادثوں کے چھ امریکی ماہرین کی ایک ٹیم بھی کر رہی تھی۔ آٹھ ہفتوں کی تفتیش و تحقیق کے بعد اس بورڈ نے حکومت پاکستان کو ایک جامع رپورٹ پیش کر دی۔ اس رپورٹ کا ایک معتدبہ حصہ سیکورٹی کی غلطیوں کی وجہ سے

اشاعت سے روک دیا گیا۔ بورڈ اس نتیجہ پر پہنچا کہ ''حادثہ کی زیادہ سے زیادہ امکانی وجہ طیارہ کے اندر تخریب کاری کی ایک مجرمانہ کارروائی تھی جس کے نتیجہ میں طیارہ گر کر تباہ ہو گیا''۔

بورڈ نے بہت سے مفروضوں اور امکانات پر غور کیا اور انہیں تجزیہ اور عملی بنیادوں پر ناممکن ہونے کی بنا پر ایک ایک کر کے ترک کر دیا۔ اس بورڈ کی ہیئت ترکیبی محدود تھی۔ چنانچہ یہ اصل مجرموں کی نشاندھی کی صلاحیت اور قابلیت کا حامل ہی نہ تھا اسے ماہرین جرائم، ماہرین تخریب کاری، ماہرین قانون اور دہشت گردوں کے خلاف کارروائی کے ماہرین کی خدمات حاصل نہ تھیں۔ حادثے کے بعد عدم دلچسپی اور بے عملی نے اس کارروائی کو فراموش شدہ ماضی کا حصہ بنا دیا۔ بے نظیر حکومت نے تو مجرموں کی نشاندھی کے لئے بظاہر کوئی اقدامات نہیں کئے۔

بورڈ آف انکوائری نے جس مجرمانہ فعل کی نشاندھی کی تھی اس کے نتیجہ میں پاک ون اپنے نہایت تجربہ کار اور ماہر عملہ کے قابو سے باہر ہو گیا۔ اس کی تائید طیارہ کے بارے میں تجزیاتی رپورٹ سے بھی ہوتی ہے۔ جہاز کے ملبے کے کچھ حصوں پر Antimony اور سلفر اور سب سے بڑھ کر Petn کے اجزاء پائے گئے۔ مؤخر الذکر وہ دھماکہ خیز مواد ہے جو تخریب کاری کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ بورڈ اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ کاک پٹ میں رکھے گئے ایک بظاہر بے ضرر دکھائی دینے والے ڈبے میں جس میں خوشبو، کوئی مشروب یا ہوا کو معطر کرنے والا مواد بھرا ہوا معلوم ہوتا ہو لیکن دراصل اس میں بے بو زہریلی گیس بھری ہو ہلکا سا دھماکہ ہوا اور جہاز کا عملہ بے حس و حرکت ہو گیا ہو۔ گیس اتنی سریع الاثر تھی کہ جہاز کے پائلٹ کو ''مے ڈے'' کا معمول کا خطرے کا سگنل دینے کا موقع بھی نہ مل سکا۔ سرکاری محاذ پر چھائی ہوئی خاموشی نے متعدد قیاس آرائیوں کو جنم دیا ہے کہ آخر ضیاء کا قاتل کون تھا؟ اس سلسلے میں مختلف امکانات کا اظہار کیا جا رہا ہے۔

کچھ مصنفین نے K.G.B کو اس سازش کا سرغنہ قرار دیا ہے جسے افغان خفیہ ایجنسی DWAD کا تعاون حاصل ہونے کا بھی امکان ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ ضیاء کی افغان پالیسی نے سوویت یونین کو اس حد تک بھڑکا دیا تھا کہ اس کے لئے ان کا وجود نا قابل برداشت ہو گیا تھا۔ وہ بورڈ کی رپورٹ کے اس حصے سے بھی سند حاصل کرتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ ''جس طرح کے نازک اور باریک طریقے سے یہ تخریب کاری ہوئی ہے اس کے لئے کسی ایسی ایجنسی کا اس کی پشت پر ہونا لازمی ہے جو اس تکنیک میں مہارت خاص رکھتی ہو بلکہ اس کے پاس اس کو عملاً استعمال کرنے کے ذرائع اور وسائل بھی موجود ہوں'' ان کا دعویٰ ہے کہ K.G.B اس طرح کی تکنیکی مہارت اور تنظیمی صلاحیت کی حامل ہے جس کے تحت پاکستان ائر فورس کا یہ جہاز ایک پیچیدہ اور ماہرانہ انداز سے تباہ کیا گیا۔

بھارتی انٹیلی جنس نے RAW کی تنظیم قائم کی تھی جو پاکستان میں سرگرم عمل ہے۔ یہ تخریب کاری اس کی کرتوت بھی ہو سکتی ہے۔ بھارت کی نظر میں جو اس علاقے میں اپنی بالادستی قائم کرنے کا خواہاں ہے اور اپنی چودھراہٹ کا خواب دیکھتا رہا ہے، ضیاء کا وجود ہمیشہ کھٹکتا رہا ہے۔ اس مہلک حادثے سے دو روز قبل راجیو گاندھی نے پاکستان کو ایک زبردست دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے بھارتی پنجاب میں سکھوں کی اعانت بند نہ کی تو اسے اپنے کئے پر پچھتانا پڑے گا۔

حادثہ کا تیسرا امکان اندرونی سازش ہو سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ضیاء کے کچھ مخالفین نے اپنے طور پر یا کسی بیرونی ایجنسی کے ہاتھوں میں کھیل کر اس حادثہ کی سازش کی ہو۔ ایک انتہا پسند تنظیم نے پہلے تو اس حادثہ کی ذمہ داری قبول کر لی تھی لیکن بعد میں انہوں نے یہ دعویٰ واپس لے لیا۔ اگرچہ مقامی عناصر کا کارروائی میں شریک ہونا بعید از امکان نہیں لیکن بورڈ آف انکوائری نے حادثہ کے پس پشت فنی مہارت کی جس سطح کی نشاندھی کی ہے اس کے تحت یہ باور نہیں کیا جا سکتا

کہ یہ سازش تمام تر اندرونی عناصر کی تیار کردہ تھی۔

اس حادثہ میں CIA کا ملوث ہونا بھی قطعی طور پر خارج از امکان نہیں۔ امریکہ میں بعض ایسی کارروائیاں اور فروگزاشتیں ہوئی ہیں جو اس سلسلے میں شکوک وشبہات کو جنم دیتی ہیں۔ اس حادثہ میں دو ممتاز امریکی شہریوں کی جانیں ضائع ہوئیں۔ امریکہ کا آزاد معاشرہ دہشت گردی سے نفرت کرتا ہے اور انسانی جانوں اور ان کے وقار کو بہت عزیز رکھتا ہے۔ ویت نام کی جنگ میں جان دینے والے امریکی سپاہیوں کے جسد خاکی کو امریکہ واپس لانے کے لئے ہر ممکن سعی کرتا رہا ہے۔ لیکن اس قسم کے جذباتی معاملے میں امریکی انتظامیہ نے اپنے طرز عمل اور طریق کار سے اس حادثہ کے اسباب تک پہنچنے کی کوششوں میں خاصی جھجک کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس کا یہ طرزعمل ناقابل فہم ہے۔ امریکی قوانین کے تحت، ایف بی آئی کو ان معاملات میں تحقیقات کا قانونی اختیار ہے جن میں امریکی شہریوں کی جان ضائع ہوئی ہو۔ اس معاملہ میں امریکہ کے وزیر خارجہ جارج شلٹز نے ایف بی آئی کو اس سلسلے میں ملوث نہ کرنے پر مجبور کیا۔ دلچسپی کی بات یہ ہے کہ بورڈ آف انکوائری کی رپورٹ پاکستان میں منظر عام پر لانے سے پہلے امریکی پریس کو مہیا کر دی گئی۔ 14 اکتوبر کے نیویارک ٹائمز میں شائع شدہ کہانی اس بات کی کوشش تھی کہ رپورٹ کے اثرات کو زائل کیا جائے اور اس میں جہاز کی فنی خرابی کو حادثہ کی امکانی وجہ قرار دے کر معاملہ کو الجھانے کی کوشش کی گئی تھی۔

امریکہ کے موقر ہفت روزوں ''ٹائم'' اور ''نیوز ویک'' نے بھی بعد میں اسی انداز فکر پر مبنی مواد شائع کیا۔

اگر اس سانحہ میں CIA کا ہاتھ تھا تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سے محرکات تھے جن کی بناء پر یہ ادارہ ضیاء جیسے شخص کو منظر عام سے ہٹانے پر تل گیا جنہیں کبھی امریکہ کا زبردست حمایتی

گردانا جاتا تھا۔اس کی پانچ وجوہات ہوسکتی ہیں۔

1۔سوویت یونین نے معاہدہ کے بعد جس کے تحت اسے اپنی فوجیں افغانستان سے واپس بلانا تھیں اس علاقے میں امریکی حکمت عملی کا بڑا مقصد حاصل ہو گیا تھا اور اب ضیاء سے جان چھڑانا ممکن تھا۔

2۔افغانستان میں بنیاد پرستوں کی حکومت کا قیام امریکی مفاد میں نہ تھا۔ بدلے ہوئے حالات میں ایسے عناصر کے لئے ضیاء کی زبردست حمایت امریکہ کو کھٹکتی تھی۔

3۔ پاکستان کا جوہری توانائی کا پروگرام شروع سے ہی امریکہ کو ناپسند تھا افغانستان کے بحران کے دور میں حکمت عملی کے تحت امریکہ نے اسلام آباد کی حمایت ایک کمتر برائی کے طور پر قبول کر لی اور اس پروگرام سے صرف نظر کئے رکھا۔ضیاء کو منظر عام سے ہٹا کر نئی حکومت کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر بہتر شرائط طے کرنا امریکہ کے لئے زیادہ قابل قبول متبادل تھا۔

4۔امریکہ یہ پسند نہیں کرتا تھا کہ یہ سپر پاور کی سطح پر اپنے تعلقات کا توازن بگاڑے بلکہ بھارت سے بھی تعلقات برقرار رکھنا چاہتا تھا۔

5۔ضیاء کی پان اسلامک سرگرمیاں، اسلامی دنیا میں امریکی مفاد سے متصادم تھیں۔

جو دو امریکی حادثہ میں جاں بحق ہوئے انہیں ابتدائی پروگرام کے مطابق الگ جہاز میں سفر کرنا تھا لیکن 16 اگست کو یہ پروگرام بدل دیا گیا۔

جنرل ضیاء اس حادثہ میں ہلاک ہونے والے واحد فرد نہ تھے۔ان کے ساتھ 31 اور افراد بھی موت کے گھاٹ اتر گئے۔ان کے اہل خانہ اور ورثاء بجا طور پر حادثہ کی وجوہات جاننا چاہتے ہیں۔انہیں اس حق سے محروم کر کے ایک غلط مثال قائم کی جائے گی اور اس سے بین الاقوامی تخریب کاری کی حوصلہ افزائی ہوگی۔کل ضیاء اور ان کے ساتھی تخریب کاری کا شکار

ہوئے۔ آنے والے وقت میں کوئی اور بے گناہ اسی انجام سے دوچار ہو سکتے ہیں۔

ضیاء سپاہی کی حیثیت سے بھی انسان تھے اور ان میں وہ تمام کمزوریاں اور خوبیاں تھیں جو کسی انسان میں ہو سکتی ہیں۔ لیکن انہوں نے پاک فوج کو مضبوط تر اور پہلے سے زیادہ پر اعتماد بنا دیا۔ ہم اس سانحہ کے ہم عصر ہونے کی بنا پر صدر ضیاء کے کارناموں کے بارے میں کوئی معروضی رائے نہیں دے سکتے۔ وہ تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں اور یہ اب تاریخ کا کام ہے کہ ان کا غیر جانبداری سے جائزہ لے۔

مغرب کا اخلاقی فرض

زبانیف برزنسکی

صدر ضیاء کی موت ایک ذاتی المیہ ہی نہیں علاقائی صورتحال کے پیش نظر ایک اہم واقعہ بھی ہے۔ وہ شخص جس کی وجہ سے سوویت یونین کو افغانستان پر مسلط کی گئی آٹھ سالہ جنگ کی ناکامی کی صورت میں اپنی بدترین سیاسی اور فوجی شکست سے دوچار ہونا پڑا، اسے اپنے حوصلہ اور استقامت کی قیمت اپنی نقد جاں کی صورت میں ادا کرنی پڑی ہے۔

ان کے ساتھ ہی پاک افواج کی تقریباً تمام اعلیٰ قیادت کا بھی صفایا ہو گیا ہے اور اس طرح وہ افراد جنہوں نے افغانستان کی تحریک مزاحمت کی خاموش لیکن مستقل معاونت میں کلیدی کردار ادا کیا تھا، منظر عام سے ہٹا دیئے گئے ہیں اور آخری لیکن اہم ترین بات یہ ہے کہ وہ ملک جو سوویت یونین اور بحر ہند کے گرم پانیوں کے درمیان حائل ہے عدم استحکام کا شکار بنا دیا گیا ہے۔

میں صدر ضیاء سے بہت اچھی طرح متعارف تھا بلکہ انہیں اپنا دوست سمجھتا تھا۔ وہ عظیم ذاتی کردار کے حامل تھے لیکن اتنے ہی منکسر مزاج بھی تھے۔ 1988ء میں میں اسی وفد کے سربراہ کی حیثیت سے اسلام آباد گیا تھا جسے امریکی صدر نے افغانستان پر روسی حملہ کے خلاف کوئی متفقہ حکمت عملی طے کرنے کا فریضہ سونپا تھا۔ میں نے کئی دن اسلام آباد میں گزارے۔ اسی سال جب صدر ضیاء امریکہ آئے تو مجھے رسمی بات چیت میں حصہ لینے کے علاوہ ان کے صدر کارٹر سے نہایت حساس مذاکرات میں شرکت کا موقعہ بھی ملا۔ سرکاری عہدہ چھوڑ دینے کے بعد میں اور میری بیوی صدر ضیاء کے مہمان کی حیثیت سے پاکستان گئے اور اس طرح ہمیں انہیں

اور بھی قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ جب صدر ضیاء سے میری پہلی ملاقات ہوئی تو پاکستان انتہائی خطرناک صورت حال سے دوچار تھا۔ افغانستان پر روسی جارحیت کے نتیجہ میں اس کی شمال مغربی سرحد کو سخت خطرہ لاحق تھا۔ دوسری طرف ایران میں شاہ کے ناگہانی زوال کے بعد ایک بے یقینی اور عدم استحکام کی صورت پیدا ہو چکی تھی۔ بھارت سے پاکستان کے تعلقات کشیدہ تھے اور امریکہ کے ساتھ تعلقات کئی برسوں سے زوال پذیر تھے۔ گویا پاکستان چین سے دوستی کے علاوہ ایک طرح سے بالکل تنہا تھا۔

جنوری 1980ء میں پاکستان کے دورے پر جانے سے پہلے میں نے صدر کارٹر کی منظوری حاصل کی تا کہ 1950ء میں امریکہ کی طرف سے پاکستان کی سلامت کے بارے میں جو یقین دہانیاں کرائی گئی تھیں، انہیں امریکن ریڈیو اور ٹی وی سے دوبارہ پیش کروں۔ صدر کارٹر نے اس نکتہ نظر سے اتفاق کیا تھا کہ روسی جارحیت کو محدود جغرافیائی تناظر میں نہیں دیکھا جا سکتا بلکہ اسے پورے خلیجی علاقے کے لئے خطرہ کا حامل سمجھنا چاہئے۔ روس نے جنوب کی جانب جو اچانک پیش قدمی کی تھی۔ اس کے آخری اہداف کا تعین مشکل تھا لیکن اس صورت حال میں پاکستان کا استحکام امریکہ کی ایک اشد ضرورت بن گیا تھا۔

دوسری طرف یہ امر واقعہ تھا کہ پاکستان یکہ و تنہا تھا۔ اپنے پہلے دورے کے دوران میں نے تفصیل سے امریکی ضمانت پر بات چیت کی تھی اور اس پر زور دیا تھا لیکن اس سے یہ صورت حالات بدل نہ سکی تھی کہ پاکستان دوطرفہ خطرے سے دوچار تھا۔ بھارتی جارحیت کے پیش نظر اسے اپنی افواج کو مشرقی سرحدوں کے دفاع کے لئے چوکنا رکھنا تھا تو دوسری طرف افغانستان کو ایک طرح سے روس کا صوبہ بنائے جانے کا امکان پیدا ہو گیا تھا۔ اس پس منظر میں سمجھا جا سکتا ہے کہ پاکستان پر دباؤ قبول کر لینے اور سمجھوتہ پر آمادہ ہو جانے کے لئے کتنی کشش رہی ہوگی۔

خصوصاً جب اس وقت تک امریکی تعاون کے بارے میں غیر یقینی کی فضا پائی جاتی تھی۔

اس انتہائی ناساز گار صورت حال میں بھی صدر ضیاء کے قدم ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں لڑکھڑائے۔ان سے پہلی گفتگو میں ہی مجھ پر یہ واضح ہوگیا تھا کہ پاکستان افغانوں کی مزاحمت کو پروان چڑھانے سے پیٹھ نہ پھیرے گا۔روسی دھمکیوں کو خاطر میں نہ لائے گا اور ان کے مطالبات کو مسترد کردے گا۔میں اس مرد جلیل کے خاموش عزم سے بہت متاثر ہوا جس کے تحت انہوں نے سوویت یونین کی جنوب مغربی ایشیاء میں علاقائی چودھراہٹ کی اجازت دینے سے انکار کردیا تھا۔مجھ پر عیاں ہوگیا کہ پاکستان ڈٹ جائے گا اور اگر امریکہ عرب اور چین مل کر مجاہدین کی مدد کریں تو وہ رائیگاں نہ جائے گی۔

اس نکتہ پر زور دینا بہت ضروری ہے۔کیونکہ لوگ آسانی سے فراموش کردیتے ہیں کہ اس وقت روس کتنا طاقت ور دکھائی دیتا تھا اور امریکہ کی مستقل اعانت کے بارے میں یقین نہ تھا۔ امریکہ ایران میں اپنے حمایتی ٹولے کے زوال کی بنا پر بھی محتاط تھا لیکن صدر ضیاء نے یہ سمجھنے میں کوئی دیر نہیں لگائی کہ روس کی جنوب کی جانب پیش قدمی کے نتیجہ میں جو عظیم کھیل شروع ہو چکا ہے، اس میں کیا کیا داؤ پر لگا ہوا ہے۔صورت حال کا یہ ادراک ہی وہ بنیاد تھی جس پر اس تعاون کی تعمیر ہوئی جس نے افغان عوام کی عظیم تحریک مزاحمت کو بالآخر کامیابی سے دوچار کرایا۔

ضیاء اس بات کا عزم صمیم کر چکے تھے کہ اب یہ کھیل اپنے انجام تک پہنچنا چاہیے۔ وہ افغانستان کی اس حیثیت کو قبول کرنے کو تیار نہ تھے کہ سوویت فوجوں کی واپسی کے بعد بھی یہ ملک اس کا گماشتہ بنا رہے۔آخری ہفتوں میں وہ مجاہدین کی مدد روک دینے کے لئے روس کی خطرناک اور حتمی دھمکیوں کو بھی خاطر میں نہ لائے۔ان کا پختہ یقین تھا کہ علاقائی استحکام کے لئے ایک صحیح معنوں میں آزاد اور مستحکم افغانستان کا وجود لازمی ہے جو ایک اسلامی اور غیر

جانبدار ملک ہواور اسی طرح پاکستان کو جنگی نقطہ نظر سے روس اور بھارت کی ممکنہ جارحیت کے مقابلہ میں علاقائی گہرائی مل سکتی ہے۔ضیاء کا قتل اگر اندرونی سازشوں کا نتیجہ بھی ہو لیکن اس سے یہ خطرہ پیدا ہو گیا ہے کہ اب روس اپنے وہ مقاصد حاصل نہ کرلے جو ان کی زندگی میں ممکن نہ تھے۔ہوسکتا ہے کہ ان کے جانشینوں کو ڈرا دھمکا کر سوویت یونین کی یہ تجویز قبول کرنے پر آمادہ کرلیا جائے کہ افغانستان کو تقسیم کردیا جائے یا اس پر ایک ایسا کمیونسٹ گروہ مسلط کردیا جائے، جس نے ہلکا سا اسلامی لبادہ بھی اوڑھ رکھا ہو۔یہ خطرہ بھی موجود ہے کہ پاکستان کو اندرونی عدم استحکام کا شکار بنا کر اس میں سیاسی بے چینی پیدا کردی جائے۔ان سب عوامل کے پیش نظر مغربی دنیا کی طرف سے پاکستان کی واضح اور مضبوط امداد اور بھی ضروری ہو جاتی ہے۔

مغربی طاقتوں بالخصوص امریکہ، یورپین کمیونٹی اور جاپان کو پاکستان کی اقتصادی امداد میں متعدبہ اضافہ کرنا چاہئے۔امریکہ کو نہ صرف فوجی اور معاشی مدد جاری رکھنا چاہئے بلکہ اس میں اضافہ کرنا چاہئے۔ہر پاکستانی کو یہ اطمینان ہونا چاہئے کہ آزمائش کی اس گھڑی میں وہ تنہا نہیں ہیں اور ان کے قائدین کو موت کے گھاٹ اتار کر ان کی خارجہ پالیسی کا تعین نہیں کرایا جاسکتا۔

اس قتل کے سلسلے میں اگر مزید حقائق سامنے آئیں تو انہیں چھان بین کے لئے اقوام متحدہ میں پیش کیا جانا چاہئے۔اگر عالمی معاملات میں جنگل کا قانون رائج ہو گیا تو عالمی فضا مسموم ہو جائے گی۔عالمی قوتوں کے اپنے مفاد میں ضروری ہے کہ بین الاقوامی معاملات میں قتل و غارت کے ان اطوار کو بے نقاب کریں اور ان کی مذمت کریں۔مغربی طاقتوں کو عام طور پر ان پاکستانی مساعی کی تائید کرنی چاہئے جو ملک میں متوازن سیاسی صورت حالات پیدا کرنے کے لئے کی جائیں۔صدر ضیاء کی موت اور ملک کی اعلیٰ فوجی قیادت میں رخنہ پیدا ہونے سے جو خلا وجود میں آیا ہے، اسے پر کرنا آسان نہیں۔

ضیاء الحق بحیثیت سپاہی

جنرل خالد محمود عارف

یہ سسکیاں بھرتے، اشکبار اور صدمے سے نڈھال انسانوں کا ایک سمندر تھا۔ یہ ہر اعتبار سے عظیم جنازہ تھا۔ مارگلہ کی پہاڑیوں کے دامن میں اسلام آباد کی نوتعمیر فیصل مسجد کے وسیع احاطہ میں دس لاکھ سے زائد پاکستانیوں نے صدر جنرل محمد ضیاء الحق کی آخری رسومات میں شرکت کی۔ ان ماتم گساروں میں افغان مہاجرین کی ایک کثیر تعداد بھی شامل تھی جن کی سوویت یونین کی جارحیت کے خلاف نو سالہ جدوجہد میں مرحوم نے غیر متزلزل اعانت کی تھی۔ لاکھوں پاکستانیوں نے جنازہ کا منظر ٹیلی ویژن پر براہ راست دیکھا یا ریڈیو سے اس پر رواں تبصرہ سنا۔

19 اگست کو (جس دن صدر ضیاء الحق کی تدفین ہوئی) سخت گرمی اور حبس تھا۔ صدر ضیاء کا تابوت پاکستان کے سفید اور سبز ہلالی پرچم میں لپٹا ہوا ایک توپ پر رکھا گیا تھا اور پاکستان کی تینوں مسلح افواج کے چوٹی کے افسروں نے اپنے جلو میں لے رکھا تھا۔ تینوں افواج کے سربراہ بھی جنازے کے ہمراہ تھے۔ تابوت اس شان سے فیصل مسجد پہنچا۔ یہ صدر ضیاء کا اپنی آخری آرامگاہ کی طرف سفر تھا جو پورے فوجی اعزاز کے ساتھ سرانجام پایا۔ آخر میں تابوت کو کندھوں پر اٹھا کر قبر کے قریب رکھ دیا گیا۔ نماز جنازہ کے بعد 21 توپوں کی سلامی دی گئی۔ صدر غلام اسحاق خان 35 ملکوں کے نمائندوں، سابق رفقاء کار، احباب، متعلقین، ماتحتوں اور بعض ناقدین کی موجودگی میں ان کا جسد خاکی اس قبر میں اتارا گیا جسے اس فوج کے جوانوں کے ایک گروپ نے کھودا تھا۔ جس کی ضیاء نے زندگی میں کمان کی تھی۔ یہ رقت آمیز مناظر تھے۔ تینوں افواج کے ایک مشترکہ چاق و چوبند دستے نے تین مرتبہ اعزازی فائر کئے۔ اپنی چمکتی دمکتی روایتی

وردیوں میں ملبوس بگل بجانے والے ایک گروپ نے آخری ماتمی بگل بجایا۔ پھر قبر ان گلدستوں کے اندر چھپ گئی، جو ممتاز شخصیتوں کی طرف سے نذرانہ عقیدت کے طور پر چڑھائے گئے۔

ضیاء کا دور ختم ہوگیا۔ وفاقی کابینہ نے انہیں فیصل مسجد میں دفن کرنے کا اعزاز بخشا کیونکہ ان کے نزدیک یہ صدر ضیاء کی اسلام اور پاکستان میں اسلامی قوانین کے نفاذ کی قابل تحسین مساعی کا اعتراف تھا"۔ صدر ضیاء نے جن کی عمر وفات کے وقت 64 برس تھی، پاکستان میں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور صدر کی حیثیت سے گیارہ برس حکومت کی۔ فوج میں ان کی خدمات 44 سال پر محیط تھیں جن میں سے 12 برس وہ فوج کے اعلیٰ ترین پیشہ ورانہ اور نہایت مطلوب عہدے یعنی چیف آف سٹاف کے منصب پر متمکن رہے۔

17 اگست 1988ء صدر ضیاء کی حیات مستعار کا آخری دن تھا اور یہ دن انہوں نے اپنے فوجی نوعیت کے فرائض ادا کرتے ہوئے گزارا، کیونکہ اس روز انہوں نے امریکہ کے ساختہ M1 ABRAM ٹینک کی مشق دیکھنی تھی تاکہ پاکستانی افواج کے لئے اس کی موزونیت کا جائزہ لیا جاسکے۔ یہ مشقیں بہاولپور کے قریب صحرا میں ٹامیوالی کی ٹینک فائرنگ رینج میں منعقد ہوئیں۔ جن ممتاز لوگوں نے یہ مشقیں دیکھیں ان میں امریکی سفیر آرنلڈ رافیل جن کی عمر 45 برس تھی اور پاکستان میں فوجی مشن کے سربراہ، 49 سالہ بریگیڈئر جنرل ہربرٹ ولیم پاکستانی جرنیلوں کا ایک گروپ اور دیگر افسر شامل تھے۔ مشقیں ختم ہوئیں تو یہ سب شخصیتیں ہیلی کاپٹر سے بہاولپور واپس آئیں جہاں انہیں امریکی ساخت کے اس بدقسمت C-130 طیارہ میں سوار ہونا تھا جو ان کے انتظار میں کھڑا تھا اور جس میں صدر ضیاء اور ان کی پارٹی اسی صبح راولپنڈی سے آئے تھے۔

17 اگست 1988ء کو بعد دوپہر اہم ترین شخصیتوں کی پرواز نے جسے اصطلاحاً ''پاک ون'' کا نام دیا جاتا تھا۔ 31 مسافروں کو لے کر بہاولپور کے ہوائی اڈے کو چھوڑا۔ جہاز معمول کے مطابق کسی دقت کے بغیر نہایت آرام سے فضا میں بلند ہوا اور ابتدائی دو منٹ تیس سیکنڈ تک بلند ہوتا رہا۔ اس دوران پائلٹ کا رابطہ بہاولپور کے ہوائی اڈے کے کنٹرول سے مسلسل برقرار رہا۔ پھر قیامت ٹوٹ پڑی۔ مواصلاتی رابطہ اچانک منقطع ہو گیا۔ یہ ٹربو جہاز جو سلامتی اور قابل اعتماد ہونے کے لحاظ سے معروف ہے مزید دو منٹ فضا میں رہا۔ یہ پراسرار اور نامعلوم صورت حال کے حامل 120 سیکنڈ جہاز کے انتہائی تجربہ کار عملے اور صدر اور ان کے ساتھیوں کے لئے اذیت ناک رہے ہوں گے۔ کچھ عینی شاہدوں نے اس جہاز کا عجیب وغریب انداز دیکھا کہ وہ ایک ننھے کھلونے کی طرح اوپر نیچے جھٹکے کھا رہا ہے اور بالآخر نہایت تیز رفتاری سے نوک کے بل ریتلی زمین میں دھنس گیا۔ جہاز اتنی قوت سے زمین سے ٹکرایا کہ اس کے انجن زمین میں 20 فٹ تک دھنس گئے۔ جہاز کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے جنہوں نے فوراً آگ پکڑ لی اور آگ کے ایک بہت بڑے گولے نے گردوپیش کے علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس حادثہ میں کسی کی جان سلامت نہ رہی۔ بعد میں انسانی جسموں کے جلے ہوئے مسخ اعضاء لاکھوں ٹکڑوں میں جمع کئے جاسکے اور نعشوں کی شناخت میں سخت دشواری پیش آئی۔ 31 افراد موت کی بھینٹ چڑھ گئے جن میں صدر پاکستان، 5 جرنیل اور دو امریکی شہری شامل تھے۔ صدر ضیاء نے دفاع پاکستان کے سلسلے میں اپنے فرائض ادا کرتے ہوئے وردی میں جام شہادت نوش کیا۔ اس شہادت نے ان کا مرتبہ عام فانی انسان کے مقام سے بہت بلند کر دیا۔

صدر ضیاء زندگی میں بھی بہت خوش قسمت تھے انہوں نے اپنی زندگی کی ابتدا نہایت معمولی حالات سے کی لیکن اپنے منتخب پیشے میں اپنی ثابت شدہ کارکردگی کی بنا پر وہ اعلیٰ ترین عہدے

تک پہنچے۔انہوں نے اپنی زندگی کی تعمیر خود اپنے ہاتھوں سے کی۔فوج میں ان کے تعلقات کمشن حاصل کرنے سے پہلے کسی سے بھی نہ تھے۔ان کی تمام تر کارگزاری ان کی پیشہ ورانہ صلاحیت میں مضمر تھی۔حالات نے کچھ ایسی کروٹ بدلی کہ وہ واحد شخص تھے جو بارہ برس تک چیف آف سٹاف کے عہدے پر متمکن رہے اور اپنی شہادت کے وقت اسی منصب پر فائز تھے۔

اگر جذبات سے عاری ہو کر خالص منطقی انداز سے سوچا جائے تو ضیاء اپنی موت کے معاملہ میں بھی خوش نصیب نکلے۔انہوں نے اس دنیا سے اس وقت منہ موڑا جب وہ طاقت اور اختیارات کے درجہ کمال پر تھے۔اپنے پیروکاروں اور مداحوں میں ان کی مقبولیت کا پیمانہ نکتہ عروج پر پہنچا ہوا تھا۔انہوں نے پاکستان کو ایک سمت اور منزل عطا کر دی تھی۔یہی ان کی زندگی کا مقصد بھی رہا تھا۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے مخالفین بھی کم نہ تھے اور ان کی زندگی میں ان مخالفین کا برسر اقتدار آنا ان کے لئے انتہائی ناخوشگوار ہوتا۔

مختلف لوگ ضیاء کو اپنے اپنے انداز میں یاد رکھیں گے۔وہ ایک محبت کرنے والے اور مشفق باپ تھے۔مذہبی طور پر ایک پرجوش شخصیت تھے۔مسلم قومیت کے فدائی تھے۔ایسے سیاستدان تھے جن کے بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔انہائی محبّ وطن پاکستانی تھے۔ان سے گفتگو کرنے میں لطف آتا تھا۔ایک قابل اعتماد پرسکون اور منکسر المزاج انسان تھے۔ان کا کام کرنے کا اپنا ذاتی انداز تھا۔افغان مجاہدین کے انتہائی مضبوط مددگار تھے۔پاکستان کی جوہری توانائی کے پروگرام کے معمار تھے۔وہ ایک سپاہی تھے جو سیاست کے داؤ پیچ کے ماہر سیاستدان کے روپ میں ڈھل گیا تھا۔وہ ایک ایسے نظریاتی انسان تھے جو معاملات میں تکمیل اور اعلیٰ معیار کا خواہاں ہوتا ہے۔ان کے پس ماندگان میں مداح بھی ہیں اور ان کے نقاد بھی۔ہم لوگ ان کی وفات کے فوراً بعد کے دور میں ان کے کارناموں کا کوئی معروضی جائزہ لینے کے اہل نہیں ہیں

لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ وہ پاکستان کی تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں اور ان کے دور کو نہ بھلایا جا سکتا ہے نہ مٹایا جا سکتا ہے۔ آنے والے وقت میں اس کے بارے میں بحث و تمحیص اور نقد و نظر کا سلسلہ جاری رہے گا۔

سر دست مجھے بحیثیت سپاہی کے ان کی کارگزاری کے بارے میں کچھ معروضات پیش کرنا ہیں۔ ضیاء الحق 12 اگست 1924ء کو بھارتی پنجاب کے شہر جالندھر کے ایک غیر فوجی متوسط اور دیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد ان کے والد نے انہیں سینٹ سٹیفن کالج دہلی میں داخل کرنے کا انتظام کیا۔ صدر ضیاء نہایت اشتیاق سے کالج میں گزرے دنوں کو یاد کیا کرتے تھے۔ جنہوں نے ان کی شخصیت کو بلوغت تک پہنچنے کے دور میں نکھار بخشا۔ کالج میں بھی نوعمر ضیاء مذہبی شعائر کی پابندی کرتے تھے اور باقاعدہ نماز ادا کرتے تھے۔

دوسری جنگ عظیم نے ضیاء کے دل میں فوج میں شرکت کا اشتیاق ابھارا۔ اس وقت وہ فورتھ ایئر میں زیر تعلیم تھے۔ ''آفیسرز ٹریننگ سکول'' میں تربیت مکمل کرنے کے بعد ضیاء کو 12 مئی 1945ء کو کمشن ملا اور انہیں برما کے محاذ پر 13 لانسرز میں تعینات کیا گیا۔

سیکنڈ لیفٹیننٹ ضیاء کو جلد ہی ایک ناخوشگوار صورتحال کا سامنا کرنا پڑا۔ ہوا یہ کہ عید کے دن دیسی لباس پہن کر جونیئر کمشنڈ افسروں سے ملنے ان کے میس میں چلے گئے ان دنوں روایتی طور پر ہندوستانی افسروں کو اپنے گھروں سے باہر لازماً مغربی لباس پہننا پڑتا تھا۔ چھٹی کے دن بھی ضیاء کا دیسی لباس زیب تن کرنا ایک ایسی غیر افسرانہ حرکت تھی جو صرف نظر نہیں کی جا سکتی تھی۔ ان کے انگریز کمانڈنٹ افسر کے نزدیک ایک نوجوان افسر کا یہ عمل ناقابل قبول تھا۔ چنانچہ تنبیہ کے طور پر ضیاء کو ایک دوسری یونٹ ..... 6 لانسرز میں تبدیل کر دیا گیا۔ دوسری جنگ عظیم کے اختتام تک ضیاء نے ملایا اور جاوا کے محاذوں پر خدمات سرانجام دیں۔ جب جاپان نے ہتھیار

ڈال دیئے تو ہندوستانی افواج وطن واپس لوٹ آئیں۔ لیفٹننٹ ضیاء کو آرمرڈ کور سنٹر میں ٹیکنیکل ٹریننگ ونگ میں تعینات کیا گیا۔

دوسری جنگ عظیم میں شکست کھانے کے بعد محوری طاقتیں تو اپنے زخم چاٹ ہی رہی تھیں فاتح اتحادیوں کی حالت بھی کچھ اچھی نہ تھی۔ امریکہ کو چھوڑ کر باقی تمام ریاستوں کی معیشت کا برا حال تھا۔ جنگ کے سیاسی اثرات بھی مرتب ہو گئے تھے۔ افریقہ اور ایشیا کی نوآبادیوں میں سیاسی بیداری کی لہر دوڑ گئی تھی۔ برطانیہ عظمیٰ کے لئے ہندوستان کو اپنے سامراجی تسلط میں رکھنا اب ممکن نہ رہا تھا۔ اس ناگزیر صورتحال کے پیش نظر برصغیر سے یونین جیک کی بالادستی ختم ہو گئی اور بھارت اور پاکستان کی آزاد ریاستوں کا قیام عمل میں آگیا۔ ضیاء نے ملازمت کے سلسلے میں پاکستان کا انتخاب کیا۔ ضیاء کا خاندان دنیوی مال واسباب سے محروم ہو کر پاکستان کی محفوظ سرزمین میں منتقل ہو گیا جب کہ پورا برصغیر ہوش وخرد سے عاری ہو کر تباہ کن فرقہ وارانہ فسادات کی لپیٹ میں آگیا، جن میں لاکھوں افراد مارے گئے اور اس سے زیادہ تعداد کو گھر بار چھوڑنا پڑا۔ ضیاء نئے ملک کی افواج میں شمولیت کے لئے آرمرڈ کور کے کچھ اور افراد کے ساتھ بذریعہ ٹرین نوشہرہ پہنچے۔ یہ ایک طویل اور پرخطر سفر تھا۔ راستے میں متعصب ہندو بلوائیوں نے کئی بار ٹرین پر گولیاں چلائیں۔ پاکستان پہنچنے پر کپتان ضیاء کو آرمرڈ کور سنٹر میں تعینات کیا گیا جو نیا نیا قائم کیا گیا تھا یہاں انہوں نے چراٹ کے مقام پر بوائز ونگ کی کمان سنبھالی۔ یہاں انہوں نے ان نوجوان لڑکوں میں قیادت کی خوبیاں ابھارنے کے لئے ان کے عہدہ داروں کو مختلف انتظامی ذمہ داریاں سپرد کیں۔ انہوں نے ایک نیا طریق کار متعارف کرایا جس کے تحت پہلی پریڈ کا آغاز زیر تربیت ریکروٹوں میں سے کوئی ایک تلاوت قرآن سے کرتا تھا۔ ستمبر میں 1950ء میں ضیاء یہاں سے تبدیل ہوئے تو آرمرڈ کور سنٹر پاکستانی فوج کی چھ آرمرڈ رجمنٹوں

کی ضروریات کی تکمیل کے لئے ایک نہایت معقول تربیتی ادارے کی شکل اختیار کر چکا تھا۔

10 اگست 1950ء کو ضیاء کی شادی لاہور میں اپنی عم زاد شفیقہ سے سرانجام پائی۔ شادی کی تقریب سادہ اور نجی نوعیت کی تھی، جس میں ان کے اعزاء کے علاوہ چند قریبی دوست شریک ہوئے۔ اس جوڑے میں ایک ناقابل رشک ذہنی ہم آہنگی پیدا ہوئی جس کے نتیجے میں ان کی رفاقت کا جذبہ جلد مستحکم ہوگیا اور وہ آخر تک قائم رہا۔ ان کے ہاں پانچ بچوں نے جنم لیا جن میں دو لڑکے اور تین لڑکیاں شامل تھیں۔ سب سے چھوٹی بچی، زین جو معذور تھی اپنے شفیق باپ کی آنکھ کا تارا تھی۔ اسے پروٹوکول کی پابندیوں سے ماورا، صدر کے دفتر اور بعض روایتی تقریبات میں بھی رسائی حاصل تھی۔ بعض اوقات جب ضیاء اپنے ملاقاتیوں سے غیر رسمی ملاقات کر رہے ہوتے تو وہ اپنے بعض ذاتی مسائل جو اس کے نزدیک اہم نوعیت کے ہوتے تھے، صدر کی توجہ حاصل کرنے کے لئے ان کے ڈرائنگ روم میں در آتی۔ زین نے جسے سماعت اور گویائی دونوں میں مشکل کا سامنا تھا، اپنے محبت کرنے والے اور شفیق باپ کی موت پر غیر معمولی حوصلہ کا ثبوت دیا۔

ضیاء ستمبر 1950ء میں گائیڈز کیولری میں تعینات ہوگئے۔ یہ رجمنٹ جاسوسی کے فرائض سرانجام دیتی تھی اور اس میں ہلکے ٹینک اور آرمرڈ کاریں شامل تھیں۔ انہیں پہلے پہل رجمنٹ کا کوارٹر ماسٹر مقرر کیا گیا۔ اس ذمہ داری کے پیش نظر انہیں رجمنٹ کے گولہ بارود کی نگرانی کرنی پڑتی تھی۔ اس خوفناک ساز و سامان کی دیکھ بھال اور حساب کتاب کے معاملے میں وہ اپنے ماتحوں پر پورا اعتماد کرتے تھے اور وہ ہمیشہ اس اعتماد پر پورے اترے۔ اس یونٹ میں انہوں نے دس سال تک خدمات سرانجام دیں اور یہیں کئی ساتھی افسروں سے ان کی عمر بھر قائم رہنے والی دوستیاں استوار ہوئیں۔ ان میں سے پیر عبداللہ شاہ، ہاشم علی خان، عباس درانی، علی امام، فضل

حق اور امیر گلستان جنجوعہ نے ریٹائرمنٹ کے بعد بھی ان کے ساتھ تعلقات برقرار رکھے۔ یہ پرانا گروپ اکثر ملتا رہتا تھا اور ان ملاقاتوں میں گزرے دور کو یاد کیا جاتا۔ جی بھر کے قہقہے لگائے جاتے اور پھر ملنے کے لئے گروپ منتشر ہو جاتا۔ ضیاء اگرچہ دنیوی مراتب میں کہیں آگے جا چکے تھے لیکن دوستوں سے مساوی سطح پر ملتے اور ان کی محفلوں میں شریک ہوتے۔ یہ لوگ اپنی جگہ ان کا مناسب احترام برقرار رکھتے۔

ضیاء نے 1955ء میں بین الاقوامی شہرت یافتہ کمانڈ اینڈ سٹاف کالج کوئٹہ کا وقت طلب کورس بآسانی پاس کرلیا۔ ضیاء کی ایک بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ وقت کی پابندی نہیں کر پاتے تھے اور یہ کمزوری ان کی فوجی زندگی میں نمایاں تھی۔ پھر وہ رسالے کے چند اور نوجوان افسروں کی طرح رنگین جرابیں پہننے کے شوقین تھے۔ ان دونوں کمزوریوں نے ان کے لئے ایک مرتبہ ایک عجیب منظر پیدا کر دیا۔ ہوا یوں کہ ضیاء پہلی پریڈ میں پانچ منٹ دیر سے پہنچے جس میں ایک سنٹر ماڈل پر بحث ہونا تھی اور کورس کے سارے افسر موجود تھے۔ وہ خاموشی سے کمرے میں داخل ہوئے۔ دیر سے آنے پر معذرت کی اور خاموشی سے سیڑھیاں چڑھ کر آخری قطار میں اپنی متعینہ نشست پر بیٹھ گئے۔ نہایت خاموش فضا میں 160 افسروں کی نگاہوں نے ضیاء کی تاخیر کا نوٹس لیا۔ اس ماڈل پر بحث کے انسٹرکٹر عتیق الرحمان تھے جو اس طرح فروگذاشت کو نظر انداز کر دینے والے نہ تھے۔ انہوں نے جذبات سے عاری چہرے سے ضیاء کی طرف دیکھا اور بڑی نرمی سے ضیاء کو حکم دیا کہ وہ کھڑے ہو جائیں اور اپنی پتلون کے پائنچے اوپر اٹھائیں۔ ضیاء نے نہایت شرمندگی سے حکم کی تعمیل کی۔ عتیق الرحمان نے ایک زوردار قہقہہ بلند کیا ''ضیاء بہت شکریہ تمہاری جرابیں بہت خوب ہیں تشریف رکھیئے''۔

سٹاف کورس میں ضیاء کی کارکردگی اتنی عمدہ تھی کہ اس بنیاد پر ان کی بقیہ فوجی زندگی میں انہیں

کئی ایسے فرائض تفویض کیے گئے جن پر کسی بھی پیشہ ور فوجی افسر کو رشک آ سکتا تھا۔ وہ 1956ء سے 1967ء تک 3 آرمرڈ بریگیڈ کے بریگیڈ میجر رہے۔ ملٹری آپریشن ڈائریکوریٹ میں 1960ء سے 1963ء تک جنرل سٹاف آفیسر رہے۔ پھر 1967ء سے 1969ء تک آرمرڈ ڈویژن میں کرنل کے عہدے کے مساوی جنرل سٹاف آفیسر رہے۔ اس اثناء میں 1963ء سے 1965ء تک وہ کمانڈ اینڈ سٹاف کالج کوئٹہ میں انسٹرکٹر رہے۔ جو فوج میں ایک ممتاز اور گراں قدر فریضہ کہا جاتا ہے۔ 1965ء میں پاک بھارت جنگ چھڑ جانے کی وجہ سے وہ یہاں معمول کے مطابق تین سال تک فرائض سرانجام نہ دے سکے۔ اس کے بعد انہیں ایک نئے قائم کردہ انفنٹری ڈویژن کے اسسٹنٹ ایڈ جوٹنٹ اور کوارٹر ماسٹر کے فرائض سپرد کیے گئے۔ انہوں نے امریکہ سے بھی دو کورسوں کی تکمیل کی جس میں 1963ء کا ایسوسی ایٹ کمانڈ اینڈ سٹاف آفیسرز کورس شامل ہے۔ مختلف عہدوں پر کام کے دوران ضیاء کو ایک نہایت محتاط اور باریک بین افسر سمجھا جاتا تھا۔ وہ کسی رپورٹ کو تاخیر سے پیش کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے تھے لیکن جب تک اس کے معیار اور مندرجات کی عمدگی کے بارے میں انہیں اطمینان نہ ہو جاتا وہ اسے پیش نہ کرتے۔

نومبر 1985ء میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جو زندگی کے بارے میں ضیاء کے رویئے پر روشنی ڈالتا ہے۔ ضیاء بریگیڈیر جنجوعہ کے ساتھ جو اس وقت میجر تھے، ایک فوجی گاڑی میں راولپنڈی سے کھاریاں جا رہے تھے، اس گاڑی کو ایک فوجی ڈرائیور چلا رہا تھا۔ جہلم کے نزدیک اس گاڑی کو ایک حادثہ پیش آیا اور ایک سویلین کی ٹانگ زخمی ہوگئی۔ ضیاء زخمی کو ہسپتال لے گئے۔ علاج کے دوران اس کی مزاج پرسی کے لئے گئے اور اسے تحفے تحائف بھی پیش کئے بدقسمتی سے یہ شخص بہت لالچی ثابت ہوا۔ اس نے عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا کہ جس گاڑی سے ٹکرا کر وہ

زخمی ہوا تھا اسے میجر جنجوعہ چلا رہے تھے اور حادثہ ان کی لاپرواہی کی وجہ سے پیش آیا۔

اس مقدمہ کی کارروائی کے دوران ضیاء صفائی کے گواہ کے طور پر پیش ہوئے اور بیان دیا کہ جنجوعہ گاڑی میں سفر کر رہے تھے اور ڈرائیور کوئی اور تھا۔ لیکن انہوں نے اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ یہ اضافہ کیا کہ ''گاڑی میں سوار فوجی افسروں میں سب سے سینئر میں تھا اور میری رائے میں حادثہ پیش آنے میں ڈرائیور کا کوئی قصور نہ تھا''۔ تاہم جو کچھ بھی ہوا سب سے سینئر ہونے کی وجہ سے میں اس کی پوری ذمہ داری قبول کرتا ہوں۔ جنجوعہ اب تک اس پورے واقعہ کو تحسین اور احسان کے جذبے کے تحت ماضی کی ایک خوشگوار یاد سمجھتے ہیں۔

پاکستانی فوج میں روایتاً ہر افسر اس یونٹ کی کمان حاصل کرنے کی تمنا رکھتا ہے جس میں اس نے خدمات سرانجام دی ہوں۔ حالات کی ستم ظریفی سے ضیاء اس مسرت سے محروم ہو گئے۔ میجر جنرل گل حسن فوج میں ایک سخت گیر منتظم تھے۔ وہ اپنے ماتحت ایک یونٹ کی کارکردگی سے غیر مطمئن تھے اور اس کے کمانڈنگ افسر کو بدلنا چاہتے تھے۔ ضیاء اس زمانے میں اس کے سٹاف افسر تھے۔ جنرل گل حسن نے انہیں حکم دیا کہ وہ 22 نمبر رسالے کی کمان سنبھال لیں۔ ضیاء نے چیلنج بڑی خوشدلی سے قبول کر لیا اور اپنی انتھک محنت سے صرف اٹھارہ ماہ میں اس رجمنٹ کو پیشہ ورانہ کارکردگی کے اعتبار سے ایک بلند معیار پر پہنچا دیا۔ ان کے اس کارنامے کی وجہ سے پورے ڈویژن میں ان کو سراہا گیا اور ان کے وقار میں اضافہ ہوا۔ ضیاء بھی 22 نمبر رسالے سے خصوصی لگاؤ رکھتے تھے اور انہوں نے اس سے باقاعدہ رابطہ برقرار رکھا۔ رسالے کے سپاہی اور جوان تو ضیاء کے شیدائی بن گئے۔

ضیاء مئی 1969ء میں بریگیڈیئر بنا دیئے گئے اور انہوں نے کھاریاں میں 9 آرمرڈ بریگیڈ کی کمان سنبھال لی۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد اکتوبر میں انہیں ڈیپوٹیشن پر اردن بھیج دیا گیا

جہاں انہوں نے دوسال تک خدمات سرانجام دیں۔

1972ء سے 1975ء تک تین سال ضیاء نے اس آرمرڈ ڈویژن کی قیادت کی۔ ان کا انداز قیادت ذاتی اور بلاواسطہ اور اکثر لگی بندھی روایات سے ہٹا ہوا ہوتا تھا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ فوجی مسائل پر ان کی جو باقاعدہ میٹنگز ڈویژن کے ہیڈکوارٹر میں منعقد ہوتی تھیں ان کے سٹاف افسروں کے علاوہ بریگیڈئر اور یونٹ کمانڈر بھی بلاناغہ شریک ہوتے تھے۔

جب کہ معمول کے مطابق یہ افسر عام میٹنگز میں نہیں آتے جن کی صدارت ڈویژن کا کمانڈر کر رہا ہو۔ یہ میٹنگز شاید و باید ہی چھ گھنٹے سے کم دورانیہ کی ہوتی تھیں۔ ان میٹنگز کا ماحول بڑی بے تکلفی کا ہوتا تھا اور شرکاء کو اظہار رائے کی آزادی تھی۔ ضیاء کی عادت تھی کہ وہ بڑے تفصیلی نوٹ لیتے تھے اور میٹنگز کے آخر میں جب کارروائی سمیٹتے تو کبھی مختصر گفتگو نہ کرتے۔

آرمرڈ ڈویژن میں ایک انتہائی سرگرم تربیتی پروگرام رائج ہو گیا جس میں ہر سطح کے کمانڈر ذاتی دلچسپی لیتے۔ ضیاء کو تقریباً تمام افسروں کے نام حفظ تھے۔ وہ بذات خود ہر سال اپنی ماتحت افواج میں ایک ایسی تربیتی مشق میں ضرور شرکت کرتے جس میں سکواڈرن اور کمپنی کی سطح کے کمانڈر شریک ہوتے۔ ہر مشق کے بعد اس کا گہرا تجزیہ کیا جاتا اور تنقیدی جائزہ لیا جاتا۔ اس سے اوپر کی سطح پر ہر یونٹ اور بریگیڈئر سال میں ایک عرصہ لازماً اپنے سپاہیوں کے ساتھ مشق میں سے گزارا جاتا۔ ڈویژنل ہیڈکوارٹر سال میں دو مرتبہ سگنل کی مشقوں میں شرکت کرتا۔ ان مشقوں میں ضیاء ریڈیو سے رابطے کے طے شدہ طریق کار کے برعکس اپنے کمانڈروں سے براہ راست مخاطب ہوتے تھے مثلاً ضیاء کی طرف سے عارف کے لئے وغیرہ۔

ضیاء ہر شخص کی بات نہایت تحمل اور غور سے سنتے۔ بالعموم وہ اپنا پروقار انداز برقرار رکھتے۔ اچھی کارکردگی کی تعریف کرتے لیکن غلطیوں پر گرفت سے گریز نہ کرتے۔ اپنے سپاہیوں کی

تربیت اوران کی فلاح و بہبود کو وہ اولیت دیتے۔ وہ ان کے لئے بڑی فراخ دلی سے عطیات دیتے اوران کے وقاراور افتخار میں اضافے کے لئے ہرممکن قدم اٹھاتے۔ ماتحت افواج بھی ان کے احکامات کی تکمیل خوشدلی سے کرتی تھیں اوران کی سادگی، بے تکلفی اور قیادت کی خوبیوں کی وجہ سے بہت عزت کرتی تھیں۔ اگر مشقوں کے دوران کوئی حادثہ رونما ہوجاتا تو وہ سب سے پہلے لوگوں کی خیریت کے بارے میں دریافت کرتے۔ سازوسامان یا گاڑیوں کا نقصان ان کے لئے دوسرے درجے پرآتا تھا۔

ضیاء روحانی تربیت کو برابر کی اہمیت دیتے تھے۔ وہ جب کبھی افسروں یا سپاہیوں سے خطاب کرتے ان کی تقریر قرآن پاک کے حوالوں سے مزین ہوتی۔ چیف آف آرمی سٹاف کی حیثیت سے انہوں نے فوج کے ایک دستے کو ہر سال حج پر بھیجنے کا سسٹم رائج کیا۔ یہ دستہ سڑک کے راستے سفر کرتا اور یہ سلسلہ بہت مقبول ہوا۔ وہ فوجی افسروں کی بیرونی سفر پر جاتے ہوئے یا فرائض کی انجام دہی کے بعد واپسی پر عمرے کی سعادت حاصل کرنے کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔

عمر کے ابتدائی حصے میں ضیاء بہت جلد جذبات میں آنے والے اور چڑ جانے والے شخص تھے۔ غلط کاموں کے بارے میں وہ بہت زودحس تھے اور غصہ پر قابو نہ رکھ سکتے تھے۔ غصہ اتارنے کے لئے وہ فوج کی ناقابل تحریر مغلظات سے بھی گریز نہ کرتے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان کے مزاج میں تبدیلی رونما ہوگئی۔ تجربے اور ذمہ داریوں میں اضافے نے ان کے مزاج میں دھیماپن پیدا کردیا۔ وہ بڑے انکسار سے یہ ذکر کرتے تھے کہ ”میں جب خانہ خدا میں حاضری دیتا ہوں تو دل سے دعا کرتا ہوں کہ میں کسی کا دل نہ دکھاؤں“ البتہ وہ اس بات کا اظہار نہیں کرتے تھے کہ وہ ان مواقع پر کس طرح زاروقطار رویا کرتے تھے۔

ان کا ظاہر بہت پرسکون تھا لیکن ان کے پہلو میں ایک حساس دل تھا جو اپنے اہل خانہ کی محبت اور شفقت سے لبریز تھا، ضیاء کو اپنی بچیوں سے بہت محبت تھی۔ ان کے برادر نسبتی ڈاکٹر بشارت الٰہی اکثر یاد کرتے ہیں کہ کس طرح میجر جنرل ضیاء 1972ء میں اپنی بیٹی قرۃ العین (جسے پیار سے عینی کہتے تھے) سے ملنے کے لئے ملتان سے لاہور کا سفر کرتے رہتے تھے جہاں وہ لاہور کالج کے ہاسٹل میں مقیم تھی۔ ملاقات کے بعد باپ بیٹی مشکل سے جدا ہوتے تھے۔ ضیاء جب رخصت ہونے لگتے تو باپ بیٹی دونوں بمشکل جذبات پر قابو رکھ سکتے تھے۔ یعنی باپ سے لپٹ جاتی اور اس کے رخسار آنسوؤں سے تر ہو جاتے اور ضیاء بھی اپنی اشکبار آنکھوں کو رومال سے چھپانے کی ناکام کوشش کرتے۔

ضیاء ملتان میں تقریباً ایک سال تک دوسری کور کے کمانڈر رہے اور پھر مارچ 1972ء میں انہیں 4 ستاروں والے جرنیل کے عہدے پر ترقی دے کر پاکستان کی فوج کا چیف آف آرمی سٹاف بنا دیا گیا۔ ملتان مدینۃ الاولیاء کہلاتا ہے۔ جس میں بہت سے بزرگوں کے مزار ہیں۔ یہاں کا موسم سرما نسبتاً نرم ہوتا ہے جبکہ گرمیاں طویل اور شدید ہوتی ہیں۔ ضیاء موسم کے شدائد کے باوجود ملتان سے بہت محبت کرتے تھے۔ انہیں یہاں بزرگوں کے مزاروں پر حاضری دے کر اور وہاں دست دعا اٹھا کر بڑی طمانیت اور روحانی تسکین حاصل ہوتی تھی۔ اکثر راتوں کو وہ مراقبہ بھی کیا کرتے تھے۔

کسی افسر کے لئے اپنے ملک کی فوج کو کمانڈ کرنا اس کی پیشہ ورانہ انا کی تسکین کا نکتہ کمال ہوتا ہے۔ ضیاء کو یہ اعزاز حاصل ہوا۔ انہوں نے اس عہدے پر اپنے کام کا آغاز بڑے جوش و جذبے اور اچھوتے طریق کار سے کیا جو جنرل ہیڈ کوارٹر کی فضاء میں تازہ ہوا کا جھونکا ثابت ہوا۔ انہوں نے فوج کی پیشہ ورانہ صلاحیت کو ترقی دینے اور اس کی کارکردگی کے لئے ضروری

سازوسامان مہیا کرنے کے لئے کئی نئے اقدامات اٹھائے۔ ان کے یہ عہدہ سنبھالنے کے ایک سال کے اندر پاکستان سیاسی انتشار کی وجہ سے مفلوج ہو کر رہ گیا کیونکہ ملک میں مارچ 1977ء کے انتخابات میں دھاندلی کے خلاف ایک زبردست تحریک اٹھ کھڑی ہوئی۔ ملک میں جولائی 1977ء کو مارشل لاء نافذ کرنا پڑا جو دسمبر 1985ء تک جاری رہا۔ ضیاء 17 اگست 1988ء تک یعنی فضائی حادثے میں افسوسناک شہادت تک فوج کے چیف کے عہدے پر فائز تھے۔ اس اعتبار سے وہ پہلے پاکستانی تھے جو 12 سال سے زیادہ فوج کے چیف آف سٹاف رہے۔ اس طویل عرصے میں پاکستان کی فوج میں دفاعی کارروائیوں، تربیت، انٹیلی جنس، انتظامی امور اور افراد کی دیکھ بھال، ہر شعبے میں تبدیلیاں رونما ہوئیں جن کا احاطہ اس مختصر تحریر میں ممکن نہیں۔

ضیاء اپنے ماتحتوں پر اعتماد کرنے والے افسر تھے جو کچھ انہیں بتایا جاتا مان لیتے جب تک یہ ثابت نہ ہو جاتا کہ اس میں کوئی غلط بیانی ہے۔ اس وجہ سے وہ بعض اوقات مشکل میں بھی پڑ جاتے کیونکہ لوگ ان کے بھروسہ کرنے والی عادت سے ناجائز فائدہ اٹھاتے اور اپنا الو سیدھا کرنے کی کوشش کرتے۔ یعنی غلط معلومات فراہم کر کے یا غلط بیانی سے اپنے مفاد میں احکامات حاصل کر لیتے۔ ان سے اس طرح حاصل کردہ بعض فیصلوں کے بارے میں حقائق سامنے آ جانے پر ان پر خط تنسیخ پھیر دیا گیا۔ لیکن بہت سے فیصلوں کے بارے میں کچھ پتہ نہ چل سکا۔ لیکن ضیاء کو اگر یہ یقین ہو جاتا کہ انہوں نے غلط معلومات کی بنیاد پر کوئی حکم جاری کیا ہے تو وہ اسے بلا جھجک بدل دیتے۔

قدرت نے ضیاء کو مسلسل محنت کرنے کی بے پناہ صلاحیت سے نوازا تھا۔ رات بھر جاگنے کے بعد بھی ان کے چہرے پر تھکن کے کوئی آثار ظاہر نہ ہوتے تھے۔ انہوں نے کرسی پر بیٹھے

بیٹھے یا سفر کے دوران نیند پوری کرنے کی خاص صلاحیت حاصل کر لی تھی۔ طول وطویل بین الاقوامی ہوائی سفر کرنے کے بعد بھی وہ تر و تازہ اور چاق و چوبند دکھائی دیتے اور میٹنگز کے طول و طویل سلسلوں میں شرکت کے لئے مستعد ہوتے۔ وہ پسند کرتے تھے کہ ان کے سامنے پیش کردہ تحریری رپورٹیں یا زبانی مشورے مربوط اور محنت سے تیار کردہ ہوں۔ وہ کتابیں، جرائد اور اخبارات تو بڑے شوق سے پڑھتے لیکن طویل دفتری نوعیت کی رپورٹیں اور فائلیں پڑھنے پر مشکل سے آمادہ ہوتے۔ اسی لئے ان کے دفتروں میں فائلوں کا کام وقت پر نہ ہو پاتا۔ تاج جو سترہ برس تک ان کے پرسنل سیکرٹری رہے ہیں اکثر ذکر کرتے ہیں کہ انہیں صاف ستھرے اور اغلاط سے مبرا ٹائپ کیے ہوئے خط بہت پسند تھے۔ وہ ہر تحریر کو لفظ بلفظ پوری احتیاط سے پڑھتے اور کبھی جلد بازی میں کسی خط پر دستخط نہ کرتے اگر کسی ڈرافٹ کو ٹائپ کرنے میں کوئی نقص رہ جاتا تو وہ کہا کرتے تھے ''بھئی ٹائپ کرتے ہوئے جاگتے رہا کرو'' ان کی یادداشت تیز تھی اور ان کی خواہش ہوتی تھی کہ انہیں ہر کام میں پیش رفت سے آگاہ رکھا جائے۔ انہوں نے ایک دفعہ تاج سے کسی تفویض کردہ کام کے بارے میں پوچھا۔ منفی جواب پانے پر انہوں نے بذلہ سنجی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہیں تنبیہہ کی ''مت بھولو کہ پنڈی کی جیل نئی تعمیر شدہ تو ہے لیکن کچھ ایسی آرام دہ بھی نہیں''۔

ضیاء باعمل لیکن وسیع النظر مسلمان تھے۔ مذہبی فرائض پابندی سے ادا کرتے، موسیقی اور فلموں سے لطف اندوز ہوتے، ٹینس، گالف اور سکواش کھیلتے۔ وہ دوسروں پر اپنے عقائد مسلط کرنے کے قائل نہ تھے۔ جوں جوں ان کی عمر بڑھتی گئی اپنے دین کی بین الاسلامی اہمیت پر ان کا یقین پختہ تر ہوتا گیا۔ صدر پاکستان کی حیثیت سے وہ اسے اپنی اخلاقی اور دینی ذمہ داری سمجھتے کہ مسلمانوں میں دین کا شعور بیدار کیا جائے۔ چیف آف آرمی سٹاف کی حیثیت سے

انہوں نے فارمیشن کمانڈرز کے نام ایک حکم نامے میں دینی کتابوں کی فہرست ارسال کی تا کہ فوج کے سپاہی اور افسران کا مطالعہ کریں اس طویل فہرست میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی کچھ کتابیں بھی شامل تھیں۔ چنانچہ بہت جلد ضیاء کو ذوالفقار علی بھٹو کے سامنے یہ وضاحت کرنی پڑی کہ ان کا تعلق مولانا مودودی کی جماعت سے نہیں تھا۔ یہ حقیقت سب کو معلوم ہے کہ بھٹو اور مولانا مودودی ایک دوسرے کے شدید مخالف تھے۔

شفیقہ اور ضیاء میاں بیوی کی حیثیت سے ایک دوسرے سے گہری وابستگی رکھتے تھے۔ ہر ایک کا مسکرا کر استقبال کرتے، انکسار ان کی طبیعت میں تھا اور مہمان نوازی ان کا شیوہ۔ اپنے ہاں مہمانوں کی پر تکلف تواضع کرتے حالانکہ شروع میں ان کی مالی حالت کچھ ایسی اچھی نہیں تھی۔ وہ آنے والے کا استقبال کچھ اس انداز سے کرتے کہ وہ جلد ہی بے تکلف ہو جاتا۔ ضیاء اگر گھر سے کہیں جاتے تو ہر شام اپنی رفیقہ حیات سے فون پر رابطہ ضرور کرتے اور اگر ملازمت کے حالات کی وجہ سے انہیں طویل عرصہ تک جدا رہنا پڑتا تو وہ گھر میں لمبے لمبے خطوط بھیجتے وہ ایک سچی مشرقی خاتون خانہ کی طرح ان خطوں کو سنبھال کر رکھتیں اور خلوت میں انہیں دوبارہ پڑھتیں۔ وہ اب ان کے لئے ایک بیش بہا خزانہ ہیں۔ شفیقہ ضیاء نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ مجھے اس مضمون میں پیش کرنے کے لئے چند خطوط منتخب کر کے دیں گی لیکن وہ اپنے جذبات پر قابو پا کر اپنے مرحوم خاوند کے تحریر کردہ خطوط کو دوبارہ پڑھ ہی نہیں سکیں کہ ان میں سے کچھ کو چن کر اشاعت کے لئے چھانٹ سکیں۔

ضیاء کو ورثہ میں بہت سے سینئر فوجی ماتحت افسر ملے تھے جنہوں نے بالعموم ان کے ساتھ نہایت وفاداری اور راست بازی سے تعاون کیا۔ جو بھی مسئلہ ان کے سامنے پیش ہوتا اس پر سیر حاصل بحث ہوتی اور لگی لپٹی رکھے بغیر جو رائے درست سمجھی جاتی بلا جھجک اور بے تکلف پیش کر

دی جاتی۔ چونکہ ضیاء کی حکومت بہت عرصہ تک رہی اس لئے انہیں بہت سے ایسے ساتھیوں سے محرومی کی قیمت ادا کرنی پڑی...... سینئر ساتھی ایک ایک کر کے ریٹائر ہوتے رہے اور نئے چہرے سامنے آنے لگے۔ چیف اور فارمیشن کمانڈرز کے درمیان فاصلے بڑھتے گئے۔ نئے افسر نہ تو اخلاص میں کم تھے نہ وابستگی میں لیکن ان کا مسئلہ یہ تھا کہ انہیں ملک کے انتظامی امور سے کوئی واسطہ نہ رہا تھا اور ان کے لئے ممکن نہ تھا کہ پاکستان کو درپیش متعدد پیچیدہ سیاسی اور انتظامی امور کے بارے میں براہ راست مشاہدے اور معلومات کی بنیاد پر کوئی سوچا سمجھا مشورہ دے سکیں۔ عمر کے آخری حصے میں ضیاء کو اپنے قریبی دوستوں کے حلقے کے مشوروں پر عمل کرنا پڑتا تھا جو اکثر ان کے مفادات کی چھلنی سے چھن کر ان تک پہنچتے تھے کیونکہ یہ لوگ اپنے ان مفادات کو اولیت دیتے تھے۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو جن عہدوں پر متمکن تھے ان کے تقاضوں کو پورا کرنے کی اہلیت سے ہی بہرہ ور نہ تھے۔

اپنی شہادت سے صرف تین ہفتے پہلے ضیاء نے راقم کو بتایا کہ ان کے کچھ بااعتماد ساتھیوں نے ان کے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ لیکن افسوس کہ ضیاء کو یہ احساس بہت تاخیر سے ہوا۔ ضیاء کے قریبی دوستوں کو یاد ہے کہ ان کے ایک ہم عصر فوجی افسر نے ایک طرح ضیاء کو نقصان پہنچایا تھا۔ لیکن صدر بننے کے بعد ضیاء نے انہیں ایک منافع بخش عہدہ پر فائز کر دیا۔

ضیاء کے طیارے کے حادثے کی پشت پر کون تھا؟ یہ سوال اب تک جواب طلب ہے۔ حادثہ کے فوراً بعد صدر اسحاق خان کی انتظامیہ نے بورڈ آف انکوائری تشکیل دیا تھا تاکہ حادثہ کی فنی وجوہات کی تحقیق ہو سکے۔ اس بورڈ کی اعانت ہوائی حادثوں کے چھ امریکی ماہرین کی ایک ٹیم بھی کر رہی تھی۔ آٹھ ہفتوں کی تفتیش و تحقیق کے بعد اس بورڈ نے حکومت پاکستان کو ایک جامع رپورٹ پیش کر دی۔ اس رپورٹ کا ایک معتدبہ حصہ سیکورٹی کی غلطیوں کی وجہ سے

اشاعت سے روک دیا گیا۔ بورڈ اس نتیجہ پر پہنچا کہ ''حادثہ کی زیادہ سے زیادہ امکانی وجہ طیارہ کے اندر تخریب کاری کی ایک مجرمانہ کارروائی تھی جس کے نتیجہ میں طیارہ گر کر تباہ ہو گیا''۔

بورڈ نے بہت سے مفروضوں اور امکانات پر غور کیا اور انہیں تجزیہ اور عملی بنیادوں پر ناممکن ہونے کی بنا پر ایک ایک کر کے ترک کر دیا۔ اس بورڈ کی ہیئت ترکیبی محدود تھی۔ چنانچہ یہ اصل مجرموں کی نشاندھی کی صلاحیت اور قابلیت کا حامل ہی نہ تھا اسے ماہرین جرائم، ماہرین تخریب کاری، ماہرین قانون اور دہشت گردوں کے خلاف کارروائی کے ماہرین کی خدمات حاصل نہ تھیں۔ حادثے کے بعد عدم دلچسپی اور بے عملی نے اس کارروائی کو فراموش شدہ ماضی کا حصہ بنا دیا۔ بے نظیر حکومت نے تو مجرموں کی نشاندھی کے لئے بظاہر کوئی اقدامات نہیں کئے۔

بورڈ آف انکوائری نے جس مجرمانہ فعل کی نشاندھی کی تھی اس کے نتیجہ میں پاک ون اپنے نہایت تجربہ کار اور ماہر عملہ کے قابو سے باہر ہو گیا۔ اس کی تائید طیارہ کے بارے میں تجزیاتی رپورٹ سے بھی ہوتی ہے۔ جہاز کے ملبے کے کچھ حصوں پر Antimony اور سلفر اور سب سے بڑھ کر Petn کے اجزاء پائے گئے۔ مؤخر الذکر وہ دھماکہ خیز مواد ہے جو تخریب کاری کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ بورڈ اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ کاک پٹ میں رکھے گئے ایک بظاہر بے ضرر دکھائی دینے والے ڈبے میں جس میں خوشبو، کوئی مشروب یا ہوا کو معطر کرنے والا مواد بھرا ہوا معلوم ہوتا ہو لیکن دراصل اس میں بے بو زہریلی گیس بھری ہو ہلکا سا دھماکہ ہوا اور جہاز کا عملہ بے حس و حرکت ہو گیا ہو۔ گیس اتنی سریع الاثر تھی کہ جہاز کے پائلٹ کو ''مے ڈے'' کا معمول کا خطرے کا سگنل دینے کا موقع بھی نہ مل سکا۔ سرکاری محاذ پر چھائی ہوئی خاموشی نے متعدد قیاس آرائیوں کو جنم دیا ہے کہ آخر ضیاء کا قاتل کون تھا؟ اس سلسلے میں مختلف امکانات کا اظہار کیا جا رہا ہے۔

کچھ مصنفین نے K.G.B کو اس سازش کا سرغنہ قرار دیا ہے جسے افغان خفیہ ایجنسی DWAD کا تعاون حاصل ہونے کا بھی امکان ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ ضیاء کی افغان پالیسی نے سوویت یونین کو اس حد تک بھڑکا دیا تھا کہ اس کے لئے ان کا وجود نا قابل برداشت ہو گیا تھا۔ وہ بورڈ کی رپورٹ کے اس حصے سے بھی سند حاصل کرتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ ''جس طرح کے نازک اور باریک طریقے سے یہ تخریب کاری ہوئی ہے اس کے لئے کسی ایسی ایجنسی کا اس کی پشت پر ہونا لازمی ہے جو اس تکنیک میں مہارت خاص رکھتی ہو بلکہ اس کے پاس اس کو عملاً استعمال کرنے کے ذرائع اور وسائل بھی موجود ہوں'' ان کا دعویٰ ہے کہ K.G.B اس طرح کی تکنیکی مہارت اور تنظیمی صلاحیت کی حامل ہے جس کے تحت پاکستان ائر فورس کا یہ جہاز ایک پیچیدہ اور ماہرانہ انداز سے تباہ کیا گیا۔

بھارتی انٹیلی جنس نے RAW کی تنظیم قائم کی تھی جو پاکستان میں سرگرم عمل ہے۔ یہ تخریب کاری اس کی کرتوت بھی ہو سکتی ہے۔ بھارت کی نظر میں جو اس علاقے میں اپنی بالادستی قائم کرنے کا خواہاں ہے اور اپنی چودھراہٹ کا خواب دیکھتا رہا ہے، ضیاء کا وجود ہمیشہ کھٹکتا رہا ہے۔ اس مہلک حادثے سے دو روز قبل راجیو گاندھی نے پاکستان کو ایک زبردست دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے بھارتی پنجاب میں سکھوں کی اعانت بند نہ کی تو اسے اپنے کئے پر پچھتانا پڑے گا۔

حادثہ کا تیسرا امکان اندرونی سازش ہو سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ضیاء کے کچھ مخالفین نے اپنے طور پر یا کسی بیرونی ایجنسی کے ہاتھوں میں کھیل کر اس حادثہ کی سازش کی ہو۔ ایک انتہا پسند تنظیم نے پہلے تو اس حادثہ کی ذمہ داری قبول کر لی تھی لیکن بعد میں انہوں نے یہ دعویٰ واپس لے لیا۔ اگرچہ مقامی عناصر کا کارروائی میں شریک ہونا بعید از امکان نہیں لیکن بورڈ آف انکوائری نے حادثہ کے پس پشت فنی مہارت کی جس سطح کی نشاندھی کی ہے اس کے تحت یہ باور نہیں کیا جا سکتا

کہ یہ سازش تمام تر اندرونی عناصر کی تیار کردہ تھی۔

اس حادثہ میں CIA کا ملوث ہونا بھی قطعی طور پر خارج از امکان نہیں۔ امریکہ میں بعض ایسی کارروائیاں اور فروگزاشتیں ہوئی ہیں جو اس سلسلے میں شکوک وشبہات کو جنم دیتی ہیں۔ اس حادثہ میں دو ممتاز امریکی شہریوں کی جانیں ضائع ہوئیں۔ امریکہ کا آزاد معاشرہ دہشت گردی سے نفرت کرتا ہے اور انسانی جانوں اور ان کے وقار کو بہت عزیز رکھتا ہے۔ ویت نام کی جنگ میں جان دینے والے امریکی سپاہیوں کے جسد خاکی کو امریکہ واپس لانے کے لئے ہر ممکن سعی کرتا رہا ہے۔ لیکن اس قسم کے جذباتی معاملے میں امریکی انتظامیہ نے اپنے طرز عمل اور طریق کار سے اس حادثہ کے اسباب تک پہنچنے کی کوششوں میں خاصی جھجک کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس کا یہ طرز عمل ناقابل فہم ہے۔ امریکی قوانین کے تحت، ایف بی آئی کو ان معاملات میں تحقیقات کا قانونی اختیار ہے جن میں امریکی شہریوں کی جان ضائع ہوئی ہو۔ اس معاملہ میں امریکہ کے وزیر خارجہ جارج شلٹز نے ایف بی آئی کو اس سلسلے میں ملوث نہ کرنے پر مجبور کیا۔ دلچسپی کی بات یہ ہے کہ بورڈ آف انکوائری کی رپورٹ پاکستان میں منظر عام پر لانے سے پہلے امریکی پریس کو مہیا کر دی گئی۔ 14 اکتوبر کے نیویارک ٹائمز میں شائع شدہ کہانی اس بات کی کوشش تھی کہ رپورٹ کے اثرات کو زائل کیا جائے اور اس میں جہاز کی فنی خرابی کو حادثہ کی امکانی وجہ قرار دے کر معاملہ کو الجھانے کی کوشش کی گئی تھی۔

امریکہ کے مئوقر ہفت روزوں ''ٹائم'' اور ''نیوز ویک'' نے بھی بعد میں اسی انداز فکر پر مبنی مواد شائع کیا۔

اگر اس سانحہ میں CIA کا ہاتھ تھا تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سے محرکات تھے جن کی بناء پر یہ ادارہ ضیاء جیسے شخص کو منظر عام سے ہٹانے پر تل گیا جنہیں کبھی امریکہ کا زبردست حمایتی

گردانا جاتا تھا۔اس کی پانچ وجوہات ہوسکتی ہیں۔

1۔سوویت یونین نے معاہدہ کے بعد جس کے تحت اسے اپنی فوجیں افغانستان سے واپس بلانا تھیں اس علاقے میں امریکی حکمت عملی کا بڑا مقصد حاصل ہو گیا تھا اور اب ضیاء سے جان چھڑانا ممکن تھا۔

2۔افغانستان میں بنیاد پرستوں کی حکومت کا قیام امریکی مفاد میں نہ تھا۔ بدلے ہوئے حالات میں ایسے عناصر کے لئے ضیاء کی زبردست حمایت امریکہ کو کھٹکتی تھی۔

3۔ پاکستان کا جوہری توانائی کا پروگرام شروع سے ہی امریکہ کو ناپسند تھا افغانستان کے بحران کے دور میں حکمت عملی کے تحت امریکہ نے اسلام آباد کی حمایت ایک کمتر برائی کے طور پر قبول کر لی اور اس پروگرام سے صرف نظر کئے رکھا۔ضیاء کو منظر عام سے ہٹا کر نئی حکومت کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر بہتر شرائط طے کرنا امریکہ کے لئے زیادہ قابل قبول متبادل تھا۔

4۔امریکہ یہ پسند نہیں کرتا تھا کہ یہ سپر پاور کی سطح پر اپنے تعلقات کا توازن بگاڑے بلکہ بھارت سے بھی تعلقات برقرار رکھنا چاہتا تھا۔

5۔ضیاء کی پان اسلامک سرگرمیاں،اسلامی دنیا میں امریکی مفاد سے متصادم تھیں۔

جو دو امریکی حادثہ میں جاں بحق ہوئے انہیں ابتدائی پروگرام کے مطابق الگ جہاز میں سفر کرنا تھا لیکن 16 اگست کو یہ پروگرام بدل دیا گیا۔

جنرل ضیاء اس حادثہ میں ہلاک ہونے والے واحد فرد نہ تھے۔ان کے ساتھ 31 اور افراد بھی موت کے گھاٹ اتر گئے۔ان کے اہل خانہ اور ورثاء بجا طور پر حادثہ کی وجوہات جاننا چاہتے ہیں۔انہیں اس حق سے محروم کر کے ایک غلط مثال قائم کی جائے گی اور اس سے بین الاقوامی تخریب کاری کی حوصلہ افزائی ہو گی۔کل ضیاء اور ان کے ساتھی تخریب کاری کا شکار

ہوئے۔ آنے والے وقت میں کوئی اور بے گناہ اسی انجام سے دوچار ہو سکتے ہیں۔

ضیاء سپاہی کی حیثیت سے بھی انسان تھے اور ان میں وہ تمام کمزوریاں اور خوبیاں تھیں جو کسی انسان میں ہو سکتی ہیں۔ لیکن انہوں نے پاک فوج کو مضبوط تر اور پہلے سے زیادہ پر اعتماد بنا دیا۔ ہم اس سانحہ کے ہم عصر ہونے کی بنا پر صدر ضیاء کے کارناموں کے بارے میں کوئی معروضی رائے نہیں دے سکتے۔ وہ تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں اور یہ اب تاریخ کا کام ہے کہ ان کا غیر جانبداری سے جائزہ لے۔

پاکستان میں اسلامی دستور سازی

محمد تقی عثمانی

پاکستان کی ناپختہ سیاسی فضا میں کسی حکومت کی پالیسیوں کا غیر جانبدارانہ اور علمی جائزہ لینا ایک مشکل کام ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ جونہی کوئی اہم قائد منظر پر ابھرتا ہے، لوگ فوراً اس کے حامی اور مخالف دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں۔ حامیوں کا اصرار ہوتا ہے کہ ان کا لیڈر موزوں ترین اور مثالی قائد ہے، جس سے کسی غلطی کا امکان ہی نہیں۔ دوسرا گروہ اسے ہر پہلو سے گھٹا کر پیش کرتا ہے اور کسی بات میں بھی اس کی تائید کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوتا۔

اس سے بھی بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ یہ آراء باہم بدلتی رہتی ہیں اور سیاسی وفاداریوں میں تبدیلیوں کے ساتھ مشروط رہتی ہیں۔ کسی بھی قائد کا ایک پر جوش حامی جب سیاسی مسلک بدلتا ہے تو اپنے ممدوح کا بدترین ناقد اور جانی دشمن بن جاتا ہے۔

اسلام کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے میں نے اس طرز عمل کی کبھی حمایت نہیں کی اور نہ ہی میں اس طرح کی گروہ بندی کا شکار رہا ہوں۔ ملکی معاملات میں میری دلچسپی ان کے اسلامی پہلوؤں تک محدود رہی ہے، جو میری رائے میں ملک کی فلاح ہی کے لئے نہیں بلکہ اس کے وجود اور بقاء کے لئے بھی بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔

میں اسی مخصوص پس منظر میں یہاں پاکستان میں قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کی مساعی بالخصوص گزشتہ گیارہ سالوں یعنی 1977ء سے 1988ء تک شہید جنرل صدر ضیاء الحق کی اس سمت میں کاوشوں کا جائزہ پیش کر رہا ہوں۔

یہ طے شدہ بات ہے کہ پاکستان اسلام کے نام پر قائم ہوا۔ بھارت سے اس کی علیحدگی

کا بنیادی مقصد ہی ایک ایسی ریاست کا قیام تھا، جہاں مسلمان اپنی زندگیاں اور اسلامی تعلیمات کے سانچے میں ڈھال سکیں۔ جہاں ایک خالص اسلامی معاشرہ تشکیل پاسکے اور جہاں زندگی کے ہر شعبے میں قرآن وسنت کی بالادستی ہو۔

اسلام دوسرے ادیان کی طرح اپنے احکامات کا دائرہ چند مذہبی رسومات وعبادات تک محدود نہیں رکھتا۔ اس کے برعکس یہ زندگی کے ہر شعبے کے لئے ایک مکمل ضابطہ حیات عطا کرتا ہے۔ اسلام ایسے جامع اصول پیش کرتا ہے کہ اگر ان پر خلوص اور لگن کے ساتھ عمل کیا جائے تو تیزی سے بدلتے ہوئے جدید دور کے مسائل حل ہوسکتے ہیں۔ اسلامی احکامات کی تفصیل بیان کرنے کے لئے فقہ کی ضخیم تصنیفات موجود ہیں ان میں کسی ایک کا بھی سرسری جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ان کا صرف ایک چوتھائی حصہ مذہبی فرائض سے متعلق ہے اور بقیہ تین چوتھائی تفصیل کے ساتھ انسانی زندگی کے معاشی، معاشرتی اور پہلوؤں سے بحث کرتا ہے۔

چنانچہ مسلمانوں پر یہ لازمی نہیں کہ وہ چند رسمی عبادات کی پابندی کریں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اسی طرح اپنی سیاسی، معاشی اور معاشرتی زندگی میں اسی خشوع وخضوع کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات کے سامنے سر تسلیم خم کردیں۔ اسلامی تعلیمات کے اس پہلو پر عمل کئے بغیر انہیں صحیح معنوں میں مسلمان قرار نہیں دیا جاسکتا۔ چنانچہ اسلام کا اجتماعی نظام قائم ہی نہیں ہوسکتا اگر اس کے نفاذ کے لئے اسلامی احکامات کی پابند ریاست کا وجود نہ ہو۔

یہی وہ بنیادی وجہ تھی جس کے لئے برصغیر کے مسلمانوں نے ایک ایسی ریاست کا مطالبہ کیا جہاں وہ اپنے عقائد کو عملی شکل دے سکیں۔ جب برطانوی سامراج برصغیر سے رخصت ہوا تو یہاں کے مسلمانوں کی واضح اکثریت متحدہ بھارت کی حامی نہ تھی جس پر لادین جمہوری عناصر یا ہندوؤں کی حکومت ہو کیونکہ اس طرح اسلام کا نظام مکمل طور پر برپا نہ ہوسکتا تھا۔ پاکستان صرف

اور صرف اسی بنیاد پر قائم ہوا۔ اگر صحیح اسلامی ریاست کا واضح نظریہ نہ ہوتا تو پاکستان کو بھارت سے الگ کرنے کا کوئی جواز نہ تھا اور نہ ہی صوبائی یونٹوں یعنی پنجاب اور بنگال کے حصے بخرے کرنے کی کوئی ضرورت تھی۔

اس پس منظر میں پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی نے مارچ 1949ء میں ایک تاریخی قرارداد منظور کی جو قرارداد مقاصد کے عنوان سے معروف ہے۔ اس قرارداد کا متن یہ ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

چونکہ اللہ تعالیٰ ہی کل کائنات کا بلا شرکت غیر حاکم مطلق ہے اور اس نے جمہوریت کی وساطت سے مملکت پاکستان کو اختیار حکمرانی اپنی مقرر کردہ حدود کے اندر استعمال کرنے کے لئے نیابتاً عطا فرمایا ہے اور چونکہ یہ اختیار حکمرانی ایک مقدس امانت ہے لہٰذا جمہور پاکستان کی نمائندہ یہ مجلس دستور ساز فیصلہ کرتی ہے کہ آزاد و خودمختار مملکت پاکستان کے لئے ایک دستور مرتب کیا جائے:

1۔ جس کی رو سے مسلمانوں کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی زندگی کو اسلامی تعلیمات و مقتضیات کے مطابق جو قرآن مجید اور سنت رسولؐ میں متعین ہیں، ترتیب دے سکیں۔

2۔ جس کی رو سے اس امر کا قرار واقعی انتظام کیا جائے کہ اقلیتیں آزادی کے ساتھ اپنے مذہبوں پر عقیدہ رکھ سکیں اور ان پر عمل کر سکیں اور اپنی ثقافتوں کو ترقی دے سکیں۔

3۔ جس کی رو سے وہ علاقے جو اب پاکستان میں داخل ہیں یا شامل ہو گئے ہیں اور ایسے دیگر علاقے جو آئندہ پاکستان میں داخل ہو جائیں گے۔ ایک وفاقیہ بنائیں جس کے ارکان

مقرر کردہ حدود اربعہ و متعینہ اختیارات کے ماتحت خود مختار رہوں۔

4۔جس کی رو سے بنیادی حقوق کی ضمانت دی جائے اور ان حقوق میں قانون و اخلاق عامہ کے ماتحت مساوات، حیثیت، مواقع قانون کی نظر میں برابری، عمرانی، اقتصادی اور سیاسی عدل، اظہار خیال، عقیدہ، دین، عبادات اور ارتباط کی آزادی شامل ہوں۔

5۔جس کی رو سے اقلیتوں اور پسماندہ و پست طبقوں کے جائز حقوق کے تحفظ کا قرار واقعی انتظام کیا جائے۔

6۔جس کی رو سے نظام عدل کی آزادی کامل طور پر محفوظ ہو۔

7۔جس کی رو سے وفاقیہ کے علاقوں کی صیانت، اس کی آزادی اور اس کے جملہ حقوق کا، جن میں اس کے بر و بحر اور فضا پر سیادت کے حقوق شامل ہیں، تحفظ کیا جائے.......... تا کہ اہل پاکستان فلاح اور خوشحالی کی زندگی بسر کرسکیں۔اقوام عالم کی صف میں اپنا جائز اور ممتاز مقام حاصل کرسکیں اور امن عالم کے قیام اور بنی نوع انسان کی بہبود و ترقی میں کما حقہ، اضافہ کرسکیں۔

یہ قرارداد بعد میں بنائے جانے والے اور نافذ کئے جانے والے تمام دساتیر میں بطور دیباچہ شامل کی جاتی رہی ہے اور صحیح سمت میں پہلے قدم کی حیثیت رکھتی ہے۔اس کے بعد دستور میں اور بھی بہت سی اسلامی دفعات شامل کی گئیں۔ان میں چند کا تذکرہ مفید ہوگا۔

1۔1973ء کے دستور کی دفعہ 2 میں اعلان کیا گیا کہ ”پاکستان کا سرکاری مذہب اسلام کا ہوگا“۔

2۔دستور کے رہنما اصولوں (دفعہ 31،z) کے تحت طے کیا گیا کہ پاکستانیم سلمانوں کے لئے ریاست مندرجہ ذیل اقدامات اٹھائے گی۔

ا.....قرآن اور اسلامیات کی تعلیم کو لازمی قرار دیا جائے گا۔عربی زبان کی تحصیل کی حوصلہ

افزائی کی جائے گی اور قرآن پاک کی اغلاط سے پاک چھپائی اور اشاعت کو یقینی بنایا جائے گا۔

ب......اتحاد کو فروغ دیا جائے گا اور اسلامی اخلاقی اصولوں کی پابندی کی جائے گی۔

ج......زکوٰۃ، اوقاف اور مساجد کی تنظیم کی جائے گی۔

3۔ان ہی رہنما اصولوں (دفعہ 38،F) میں طے کیا گیا کہ جتنی جلدی ممکن ہو سکا سود ختم کر دیا جائے گا۔

4۔آئین کی دفعہ 227 کے تحت ملک کے تمام قوانین کو قرآن وسنت کے مطابق ڈھالا جانا اور اسلامی تعلیمات کے منافی قانون سازی کی روک تھام طے کر دی گئی۔

5۔دستور میں طے کر دیا گیا کہ کوئی شخص پاکستان کا صدر یا وزیر اعظم نہیں بن سکے گا اگر وہ مسلمان نہ ہو۔ان عہدوں کے لئے جو حلف دستور کے شیڈول میں شامل کیا گیا اس میں یہ الفاظ موجود ہیں۔

''میں.........حلفیہ اقرار کرتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں، خدا کی وحدانیت میں یقین رکھتا ہوں، اس کی کتابوں پر ایمان رکھتا ہوں اور قرآن کو اس کی آخری کتاب مانتا ہوں، حضرت محمد ﷺ کو اس کا آخری نبی مانتا ہوں اور یہ کہ ان کے بعد کوئی نبی نہیں آسکتا، قیامت پر ایمان رکھتا ہوں، قرآن وسنت کی تعلیمات اور تقاضوں کو مانتا ہوں......اور میں اسلامی نظریہ کی بقاء کا عہد کرتا ہوں جو پاکستان کے قیام کی بنیاد ہے''۔

آخری مجلّہ وفاقی اور صوبائی وزیروں، سپیکروں، ڈپٹی سپیکروں، قومی اور صوبائی اسمبلی کے ممبروں اور سینٹ کے چیئرمین اور ممبروں کے حلف میں شامل ہے۔

یہ 1973ء میں متفقہ طور پر منظور کئے گئے دستور کے واضح عناصر ہیں، جن سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ پاکستان کوئی لادینی ریاست نہیں اس کی بنیاد اسلامی نظریہ حیات کے علاوہ اور کچھ

نہیں۔

اس نوعیت کی دفعات 1956ء اور 1962ء کے دساتیر میں بھی شامل تھیں لیکن 1973ء کا دستور اس سلسلے میں زیادہ متعین اور تفصیلی وضاحت کا حامل ہے۔ اس میں ریاست کے اسلامی کردار پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔

اب مندرجہ بالا حقائق سے یہ تو بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ پاکستان کے حکمرانوں کا پاکستان کے قوانین نیز سیاسی، معاشی اور معاشرتی شعبوں کو اسلامی رنگ میں ڈھالنا لازمی فریضہ تھا لیکن اگر ان کے رویہ کا جائزہ لیا جائے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ ملک کی تاریخ میں اس سمت میں ان کا کردار ہمیشہ اس فریضہ کو صرف نظر کرنے کا رہا ہے۔ عملاً متذکرہ بالا دفعات کو نظر انداز ہی کیا جاتا رہا ہے۔ یہ اسی طرح غیر موثر رہیں جس طرح کسی غیر ذمہ دار پارٹی کا منشور، جو منتخب ہونے کے لئے تو بلند و بانگ دعوے کرتی ہے اور وعدوں کے سبز باغ دکھاتی ہے لیکن بر سر اقتدار آ کر اسے فراموش کر دیتی ہے۔ اسلامی نظام کے نفاذ کے سلسلے میں بس اس پر اکتفا کیا گیا کہ یہ دفعات آئین میں شامل کر لی گئیں لیکن عملاً اسلامی تعلیمات پر مبنی ایک بھی قانون کبھی نافذ نہ کیا گیا۔ نہ ہی کوئی ایک قانون اس بنیاد پر تبدیل کیا گیا کہ وہ اسلامی تعلیمات کے منافی ہے۔ ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی۔ ملک کی آزادی کے 30 سال بعد 1977ء میں حکمرانوں کو اتنی توفیق ہوئی کہ وہ جمعہ کو ہفتہ وار تعطیل قرار دیں۔

1977ء کے انتخابات کے دوران ملک میں ایک زبردست عوامی تحریک برپا کی گئی جس کا دعویٰ تھا کہ وہ ملک میں دیرینہ مطالبے کے مطابق نظام اسلام کا نفاذ چاہتی ہے۔ اس تحریک کے نتیجے میں اس وقت کے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے اسلامی نظام کے نفاذ کی سمت تین اہم

اقدامات کے طور پر یہ اعلان کیا کہ:

1۔ مسلمانوں کے لئے شراب ممنوع قرار دی گئی

2۔ نائٹ کلب بند کردیئے گئے

3۔ گھوڑوں کی ریس پر پابندی عائد کردی گئی

اس تحریک کا مقصد مسٹر بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹنا تھا۔ وہ ان اقدامات سے مطمئن نہ ہوئی اور اس کے نتیجے میں جنرل محمد ضیاء الحق کی قیادت میں مارشل لاء نافذ کردیا گیا۔ جنرل ضیاء نے عنان اقتدار سنبھالتے ہی اعلان کیا کہ ان کا اولین ہدف ملک میں نظام اسلام کا نفاذ ہے۔ وہ بنیادی طور پر دیندار انسان تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس سلسلے میں سنجیدہ ہیں۔

ان کی سیاسی پالیسیوں اور اقدامات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ان کے عہد میں پہلی مرتبہ ملک کے نظام کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کا مقصد بنیادی پالیسیوں میں شامل کیا گیا اور ان کے نفاذ کے لئے عملی قدم اٹھائے گئے۔ یہ ٹھیک ہے کہ حکومت کی پوری کوشش اور لگن کے باوجود اسلامی نظام کی طرف پیش رفت بہت سست رہی۔ صحیح منصوبہ بندی نہ کی جا سکی اور ترجیحات کی درست ترتیب بھی نہ ہو سکی اور ان پالیسیوں کے نفاذ کے سلسلے میں مناسب اور مؤثر اقدامات کا افسوس ناک فقدان رہا۔ لیکن یہ بھی اپنی جگہ حقیقت ہے کہ ان گیارہ سالوں میں جو کام اس سلسلے میں کیا گیا، وہ پچھلے تیس سالوں کے اس سمت میں اٹھائے گئے اقدامات پر بھاری تھا۔ اس مختصر مضمون میں تفصیل سے ان اقدامات کا ذکر ممکن نہیں۔ اس لئے انہیں اجمالاً بیان کیا جائے گا۔

جنرل محمد ضیاء الحق نے اقتدار سنبھالنے کے فوراً اسلامی نظریاتی کونسل کی تشکیل نو کی (آئندہ اوراق میں اس کا ذکر صرف "کونسل" کے طور پر کیا جائے گا) یہ کونسل ایک آئینی ادارہ ہے۔ اس

کی ہئیت ترکیبی میں کم از کم آٹھ اور زیادہ سے زیادہ بارہ ممبروں کا ہونا ضروری ہے، جن میں اعلیٰ عدالتوں کے ججوں کے علاوہ، مختلف مکاتب فکر کے نمائندہ چار علماء اور کم از کم ایک خاتون شامل ہو۔

اس کونسل کے مقاصد دستور کی دفعہ 230 میں اس طرح درج ہیں:

اسلامی کونسل کا فرض ہوگا کہ:

(الف) مجلس شوریٰ (پارلیمینٹ) اور صوبائی اسمبلیوں کو ایسی سفارشات پیش کرنے جن کے تحت پاکستانی مسلمان، انفرادی اور اجتماعی طور پر قرآن وسنت میں دی گئی اسلامی تعبیر کے مطابق ہر شعبہ میں اپنی زندگی کو ڈھالنے کے قابل ہوسکیں۔

(ب) کسی بھی ایوان، صدر مملکت یا گورنر یا صوبائی اسمبلی کو ایسے امور پر جو اس کے سامنے پیش کئے گئے ہوں، مشورہ دینا کہ آیا متعلقہ مجوزہ قانون قرآن وسنت کی تعلیمات کے منافی ہے یا نہیں؟

(ج) ملک کے موجودہ قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لئے سفارشات پیش کرنا۔ نیز ان سفارشات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے مدارج مقرر کرنا۔

(د) مجلس شوریٰ (پارلیمینٹ) اور صوبائی اسمبلیوں کی رہنمائی کے لئے اسلامی تعلیمات کو مناسب صورت میں مرتب کرنا تاکہ انہیں قانونی شکل دی جاسکے۔

1962ء کے دستور میں ایسی دفعات موجود تھیں اور یہ کونسل 1962ء سے موجود تھی لیکن حکومتوں کے عدم التفات کی بنا پر اس سلسلے میں 1977ء تک کوئی قابل ذکر کام نہیں ہوسکا تھا۔ 1973ء کے دستور کے تحت لازمی تھا کہ کونسل ایک سالانہ رپورٹ پیش کرے اور سات سال کے اندر آخری رپورٹ مکمل کرکے پیش کردے۔ دفعہ 23 کی ذیلی دفعہ 4 کے تحت پارلیمینٹ

کو اس پر ایوان میں بحث کرنا تھی لیکن نہ تو کبھی کوئی رپورٹ تیار ہو کر پیش ہوئی نہ اس پر بحث ہوئی۔ چنانچہ اس سلسلے میں کوئی قانون بھی نافذ نہ ہو سکا۔

1977ء میں جنرل ضیاء نے جسٹس محمد افضل چیمہ کی سربراہی میں اس کونسل کی تشکیل نو کی اور انہیں کام کو تیزی سے نپٹانے کی ہدایت کی۔ یہ اہم کام قبول کرتے ہوئے کونسل نے ایک سال کے اندر اندر متعدد موقر رپورٹیں پیش کر دیں۔ وزارت قانون کے تعاون سے نئے اسلامی قوانین مرتب کئے گئے۔ ماہرین معاشیات اور بنکاری پر مشتمل ایک پینل مقرر کیا گیا، جس کے ذمہ معاشی نظام کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لئے سفارشات پیش کرنا تھا۔ اس سلسلے میں زکوٰۃ کے نظام کے قیام اور سود کے خاتمہ پر زور دیا گیا۔ اسلامی تعلیمی نظام کے لئے بھی ایک تفصیلی رپورٹ تیار کی گئی اور ذرائع ابلاغ کی پالیسی کی ترتیب نو کے لئے بھی جامع سفارشات مرتب کی گئیں۔

1979ء میں کونسل کی پیش کردہ رپورٹوں اور سفارشات کی بنا پر اسلامی قوانین کا ایک پیکج متعارف کرا دیا گیا۔ بعض اسلامی تعلیمات کو پہلی مرتبہ قانونی شکل دی گئی اور قانون کی بنیادی کتابوں میں بہت سے اسلامی قوانین شامل ہو گئے۔

کونسل نے دستور میں بعض ترامیم کی بھی سفارش کی تاکہ دستور کی اسلامی دفعات کو بھی دیگر دفعات کی طرح مؤثر بنایا جا سکے۔

کونسل نے سود کے خاتمے اور بنکوں اور مالیاتی اداروں میں اسلامی تعلیمات پر مبنی سود سے پاک نظام متعارف کرانے کے سلسلے میں بھی جامع سفارشات پر مشتمل رپورٹ پیش کی۔

بعد میں کونسل کو جسٹس تنزیل الرحمن کی سربراہی میں دوبارہ تشکیل دیا گیا تو پورے جوش و جذبے سے اس کا کام جاری رہا۔ اس نے اکثر موجودہ قوانین کو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں

دوبارہ مرتب کر دیا اور انہیں کتاب وسنت کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے تفصیلی سفارشات پیش کر دیں۔ اس کے علاوہ کونسل نے تفصیل سے یہ سفارشات بھی پیش کر دیں کہ روزمرہ معاملات میں بعض اسلامی پالیسیوں کے نفاذ سے جو مشکلات اور پیچیدگیاں پیدا ہوں گی، انہیں عملاً کس طرح حل کیا جاسکتا ہے 1977ء سے 1985ء تک کونسل نے جو تفصیلی کام کر ڈالا، وہ اتنا قیمتی ہے کہ بجاطور پر اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے عملی بنیاد کا نام دیا جاسکتا ہے۔ اگر ان تمام سفارشات کو عملی جامہ پہنا دیا جاتا تو اسلامی نظام کے خواب کی عملی تعبیر سامنے آنی شروع ہو جاتی۔ لیکن شومئی قسمت کہ اس کے صرف ایک معمولی جزو پر عمل ہوسکا۔ اسی لئے مطلوبہ نتائج پوری طرح سامنے نہ آسکے۔ تاہم کونسل کی سفارشوں کو بنیاد بنا کر حکومت نے جو مندرجہ ذیل قدم اٹھائے، انہیں بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اپنی خامیوں کے باوجود پچھلے تین عشروں میں ان کی نظیر پیش نہیں کی جاسکتی۔

زکٰوۃ اور عشر کا قانون

ملک میں قانونی ارو معاشی شعبہ کو اسلامی سانچے کے کام کی ابتدا ملک میں زکٰوۃ اور عشر کے قانون کے نفاذ سے ہوئی۔ زکٰوۃ اسلام کا دوسرا ستون ہے اور غربت کے خاتمے اور تقسیم دولت میں توازن پیدا کرنے کے لئے ایک اہم ادارہ ہے۔

اسلامی ریاست کی بنیادی ذمہ داری ہے کہ امراء سے زکٰوۃ جمع کرے اور غرباء میں تقسیم کرے۔ اس بات کا خدشہ تھا کہ اگر زکٰوۃ کی تحصیل اور تقسیم کا سرکاری ملازمین کے ہاتھوں میں دی گئی تو اس کا پیسہ بدعنوان لوگوں کی دسترس میں آجائے گا۔ اس خرابی سے حتی الامکان بچنے کے لئے ایک آزاد کونسل کا قیام عمل میں آیا، جس کی نگرانی سپریم کورٹ کے ایک جج کے سپرد کی گئی۔ یہ کونسل جو سرکاری ملازمین سے بالکل مبرا تھی، زندگی کے مختلف شعبوں کے نمایاں افراد پر

مشتمل تھی۔ زکوٰۃ کی تحصیل اس کے سپرد کی گئی۔ زکوٰۃ فنڈ قومی خزانے سے بالکل الگ رکھا گیا اوراس کی تقسیم کے لئے ہر سطح پر زکوٰۃ کمیٹیاں بنائی گئیں۔ ان کمیٹیوں کے ممبروں کا چناؤ کھلے الیکشن سے ہوا، جو عام طور پر مساجد میں منعقد ہوئے۔

اگر چہ اب بھی شکایات ہیں کہ اس نظام میں کہیں خرابیاں در آئی ہیں پھر بھی بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ بدعنوانیوں سے معمور معاشرہ میں یہ نظام جس حد تک ممکن تھا، صحیح خطوط پر استوار کیا گیا۔ لاکھوں روپے ضرورت مندوں اور غرباء میں تقسیم کئے گئے اور ہزاروں افراد کو مستقل روزگار کے حصول کے قابل بنایا گیا۔

چونکہ یہ اپنی نوعیت کا پہلا تجربہ تھا، اس لئے زکوٰۃ کے موجودہ نظام پر بلاشبہ بعض شبہات ہو سکتے ہیں اوراس میں بہت سی اصلاحات اب بھی ممکن ہیں۔ پھر بھی نظام تشکیل پا چکا ہےاور ایک قابل عمل ڈھانچہ معرض وجود میں آ چکا ہے۔ کم از کم صحیح سمت میں کام شروع ہو چکا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس نظام کی خوبیوں اور خرابیوں کا مستقل اورمحتاط جائزہ لیا جاتا رہےاور تجربہ سے جو نتائج سامنے آئیں، ان سے دانش مندی سے فائدہ اٹھایا جائے۔ کسی نظام کے بارے میں یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ابتداء سے ہی خرابیوں سے بالکل پاک ہے۔ یہ تو تجربہ کی بات ہےاوراس نظام کو کامیاب بنانے کے لئے اس میں اضافہ بھی کیا جا سکتا ہےاور بعض پہلوؤں کو ترک بھی کیا جا سکتا ہے۔

حدود سے متعلق قوانین

1979ء میں اسلامی نظام کی طرف پیش رفت کے سلسلے میں دوسرا اہم قوانین کا سلسلہ شرعی حدود سے تعلق رکھتا ہے۔ جس سے اسلام کی معتدبہ تعزیری سزائیں نافذ ہو گئی ہیں۔ چوری، ڈکیتی، بدکاری، جعل سازی اور شراب خوری کے بارے میں قرآن وسنت میں بیان کردہ

سزاؤں کو ملکی قوانین کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ اسلامی سزاؤں کے بارے میں مغرب کے بے پناہ پروپیگنڈے کی وجہ سے ہمارے مغرب زدہ حکمران ان سزاؤں کو رائج کرنے سے ہمیشہ جھجکتے رہے ہیں۔ اس کے برعکس جنرل ضیاء الحق کی حکومت نے کسی جھجک کا مظاہرہ کئے بغیر ان سزاؤں کو پوری جرأت اور اعتماد سے نافذ کر دیا۔

یہ ہمارے نظام کی بدقسمتی ہے کہ پولیس اور دیگر تفتیشی ادارے شاذ و نادر اپنے فرائض دیانت داری سے سرانجام دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے جرائم کی شرح میں اضافہ ہوتا ہے۔ بہت سے مجرم اپنے کئے کی سزا پاتے ہیں۔ اخبارات میں جرائم کی خبروں کا ائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ روزانہ درجن بھر چوریاں یا ڈکیتیاں وقوع پذیر ہوتی ہیں لیکن اس کے مقابلے میں بہت کم کیس درج ہوتے ہیں جرائم کا ارتکاب کرنے والوں کی بڑی تعداد یا تو فرار ہو جاتی ہے یا ابتدائی پوچھ گچھ کے بعد چھوڑ دی جاتی ہے۔

نظام کی ایک خرابی کی وجہ سے حدود کے کیس بہت کم سامنے آتے رہے ہیں۔ اس کے برعکس اسلام نے ان جرائم کی سزا تو بہت سخت رکھی ہے لیکن اس کے اجرا کے لئے شہادت کا معیار بہت کڑا رکھا ہے اور سخت شرائط عائد کی ہیں۔ حدود کے قوانین ان شرائط سے مشروط ہیں۔ عام طور پر یہ تنقید کی جاتی ہے کہ آج تک کسی پر حد جاری نہیں کی گئی لیکن اس کا بنیادی سبب یہی شرائط ہیں حدود کے اجراء کے ساتھ ساتھ ضروری تھا کہ جرائم کی تفتیش اور مقدمات کے نظام کی بھی جامع اصلاح کی جاتی۔ اس ضروری پہلو کو نظر انداز کر دینے کی وجہ سے ہی موجودہ صورت حال پیدا ہوئی ہے۔

پھر بھی اس سے یہ مطلب نہ لیا جائے کہ یہ قوانین بے اثر رہے ہیں۔ حدود کی سزائیں تو اب تک کسی پر جاری نہیں ہوئیں لیکن ان قوانین کے تحت ''تعزیر'' کا اجرا بہت سے لوگوں کے لئے

ہو چکا ہے اور اس سے متعلق جرائم میں کمی واقع ہوئی ہے۔

مختصر یہ کہ پاکستان کے فوجداری قوانین اب زیادہ تر اسلامی تعلیمات پر مبنی ہیں اور جب بھی ہم اپنے تفتیشی نظام اور عدالتی کارروائی کی اصلاح کرلیں گے تو ان قوانین کے مطلوبہ نتائج برآمد ہوسکیں گے۔

فیڈرل شریعت کورٹ

قانونی نظام کو اسلامی بنیادوں پر استوار کرنے کے سلسلے میں ایک اور قدم شریعت کورٹ کا قیام ہے۔

پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ ملک کی آزادی کے بعد پاکستان کے ہر دستور میں یہ طے کردیا گیا تھا کہ پاکستانی قوانین کو قرآن وسنت کے مطابق بنایا جائے گا اور اسلامی تعلیمات کے خلاف کوئی قانون سازی نہیں کی جائے گی۔ لیکن دستور کی ان شقوں کو نہ تو قابل عمل بنایا گیا اور نہ دوسری شقوں کی طرح ان کے بارے میں عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے کی گنجائش رکھی گئی۔ چنانچہ کسی قانون کو بھی عدالت میں اس بنیاد پر چیلنج نہیں کیا جاسکتا تھا کہ وہ اسلام کے خلاف ہے۔

ظاہر بات ہے کہ کسی ملک کے قوانین لازماً اس کے دستور کے مطابق ہونا چاہئیں اور قانون کے بارے میں بھی سپریم کورٹ کا دروازہ کھٹکھٹا کر اسے خلاف دستور ثابت کر کے اسے ساقط قرار دینے کی گنجائش ہونی چاہئے۔ دستور کی اسلامی شقوں کو ایسا کوئی تحفظ فراہم نہیں کیا گیا تھا۔ چنانچہ حکومت پر خلاف اسلام قوانین بنانے اور نافذ کرنے کے خلاف کوئی پابندی نہ تھی۔ دستور کی اسلامی شقیں قانونی قوت نافذہ سے محروم تھیں اور ملک کے قانونی نظام میں محض کتابی حیثیت کی حامل تھیں۔ ان کے نفاذ کے لئے طریق کار وضع ہی نہیں کیا گیا تھا۔

اسلامی حلقوں کا ہمیشہ یہ مطالبہ رہا ہے کہ دستور کی دیگر شقوں کی طرح ان کو بھی عدالتی دائرہ

کار میں لایا جائے۔ اسلامی نظریاتی کونسل بھی اس کے حق میں تھی۔ جنرل ضیاء الحق نے پہلی مرتبہ اس تجویز کو جزوی طور پر قبول کیا اور اس مقصد کے لئے ایک الگ اعلیٰ عدالت فیڈرل شریعت کورٹ کے نام سے قائم کی گئی اور اس کی تشکیل، اختیارات اور دائرہ کار کو طے کرنے کے لئے 23 جون 1980ء سے دستور میں باب 3A کا اضافہ کر دیا گیا۔

اس عدالت کے ججوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد آٹھ مقرر کی گئی ہے۔ جن میں سے تین کا مسلم علماء میں سے ہونا لازمی ہے جو شریعت پورا عبور رکھتے ہوں۔ چار دوسرے جج یا تو ہائی کورٹ کے جج رہ چکے ہوں یا اس منصب پر فائز ہونے کی اہلیت رکھتے ہوں۔

دستور کی دفعہ 203D میں اس عدالت کا دستوری دائرہ اختیار واضح کر دیا گیا ہے۔

''یہ عدالت خود اپنی رضامندی سے یا کسی پاکستانی شہری، وفاقی حکومت یا صوبائی حکومت کی درخواست پر کسی قانون کے بارے میں جائزہ لے کر فیصلہ کر سکتی ہے کہ وہ قرآن وسنت میں دی گئی اسلامی تعلیمات کے خلاف تو نہیں۔ قرآن وسنت کی طے شدہ حدود کا تذکرہ آئندہ اسلامی تعلیمات کے نام سے کیا جائے گا''۔

دستور کی دیگر دفعات میں یہ بھی طے کر دیا گیا کہ جب یہ عدالت کسی قانون کو اسلامی تعلیمات کی کسوٹی پر پرکھے گی تو متعلقہ وفاقی یا صوبائی حکومت کو باقاعدہ نوٹس دے کر اسے اپنا نکتہ نظر پیش کرنے کا پورا موقع فراہم کرے گی۔ اگر تمام فریقوں کو سننے کے بعد عدالت یہ فیصلہ دے دے کہ کوئی قانون یا اس کی کوئی شق اسلامی تعلیمات کے منافی ہے تو اپنے اس فیصلہ کے نفاذ کی تاریخ بھی متعین کرے گی۔ جس کے بعد وہ قانون یا اس کا وہ حصہ جسے شریعت کے منافی قرار دیا گیا ہے ساقط ہو جائے گا۔

یہ بھی طے کر دیا گیا ہے کہ اس نوعیت کے فیصلے کے بعد متعلقہ حکومت اس قانون میں شریعت

کے مطابق ترمیم کرنے کے اقدامات کرنے کی پابند ہوگی۔

اس عدالت کے فیصلہ کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل کی جا سکے گی جسے سننے کے لئے شریعت اپیلٹ بنچ کے نام سے خصوصی بنچ تشکیل دیا جائے گا۔ یہ بنچ سپریم کورٹ کے تین ججوں اور شریعت کورٹ کے دو علماء ججوں پر مشتمل ہے۔ یہ شریعت کورٹ اور شریعت اپیلٹ بنچ خصوصی اختیارات کے حامل ہیں اور قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لئے غیر معمولی اقدام کرنے کی حیثیت رکھتے ہیں اور پاکستان اس سلسلے میں دیگر اسلامی ممالک کے مقابلے میں پیش رو کی حیثیت رکھتا ہے۔

کئی قوانین کو اس عدالت کے دائرہ اختیار سے باہر رکھا گیا ہے۔ دستور کے علاوہ Procedera قوانین اور پرنسپل لاء فیڈرل شریعت کورٹ کے دائرہ سے باہر رکھے گئے ہیں۔ مالیاتی قوانین اور بنک اور انشورنس سے متعلقہ قوانین بھی دس سال کے لئے اس عدالت کے حیطہ اختیار سے باہر رکھے گئے۔ (یہ مدت 1990ء میں ختم ہوگئی) حکومت کی رائے میں یہ قدم اس لئے ضروری تھا کہ بصورت دیگر عدالت میں پیشیوں کا ایک سیلاب آ جاتا اور ملک کے اقتصادی نظام کو چلانے میں بہت سی عملی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ 1988ء میں ان حدود کے خاتمے کے لئے پرزور کوششیں جاری تھیں اور پارلیمنٹ کے سامنے بہت سے بل زیر غور تھے کہ قومی اسمبلی تحلیل کر دی گئی اور یہ معاملہ پھر لٹک گیا۔

فیڈرل شریعت کورٹ اور اپیلٹ شریعت بنچ کو حدود کے کیسوں میں اپیلوں کی سماعت کا اختیار حاصل تھا لیکن ان کا اصل کام اسلامی تعلیمات کی روشنی میں قوانین کا جائزہ لینا تھا۔ اگرچہ فیڈرل شریعت کورٹ اور اپیلٹ شریعت بنچ بہت سے اہم قوانین کا جائزہ اس وجہ سے نہیں لے سکتے کہ وہ ان کے دائرہ کار سے خارج کر دیئے گئے ہیں تاہم انہوں نے اپنے

اختیارات کے دائرے میں آنے والے قوانین کے بارے میں تاریخی فیصلے صادر کئے ہیں اور اس طرح موجودہ قوانین کو شریعت کے مطابق ڈھالنے کی راہ ہموار کی ہے اور عدلیہ اور قانونی پیشے سے متعلق افراد کو قانون سازی کی نئی راہیں دکھائی ہیں۔

پہلے یہ تفصیل گزر چکی ہے کہ پاکستان کی تاریخ کے ابتدائی چالیس سالوں میں نہ تو پارلیمینٹ نے کسی ایک قانون کو بھی شریعت کے منافی ہونے کی بنا پر تبدیل کیا اور نہ اسلامی تعلیمات کے نفاذ کے لئے کوئی قانون نافذ کیا۔ سیاسی جوڑ توڑ بلکہ توڑ پھوڑ نے پارلیمینٹ کے ممبروں کو کبھی اتنا وقت دیا ہی نہیں کہ وہ کوئی تعمیری کام کر سکیں جس کے لئے زیادہ سازگار ماحول کی ضرورت ہوتی ہے لیکن فیڈرل شریعت کورٹ اور اپیلٹ شریعت بنچ نے اپنے اختیارات کو بروئے کار لا کر متعدد قوانین کو تبدیل کر دیا ان کے بعض فیصلہ اتنے اہم تھے کہ عدالتوں میں لٹکے ہوئے ہزاروں مقدموں کا فیصلہ ہو گیا اور ان مقدمات کے فریقوں کو مقدمہ بازی سے نجات مل گئی جو بصورت دیگر مکمل نہ ہوتا۔

جن قوانین میں اس طرح ترمیم کی گئی ان کی فہرست بہت طویل ہے اور ان کا تعلق معاہدوں اور ٹھیکوں، خرید و فروخت، حصہ داری، زراعت اور کرایہ داری، سول سروس، پریس اینڈ پبلی کیشنز، سیکورٹی کے اقدامات، فوجی قواعد و ضوابط اور وراثت وغیرہ سے ہے۔

نیز اس طرح کے مقدمات میں جو فیصلے سنائے گئے ان سے قرآن و سنت کی تشریح و توضیح کے لئے بنیادی اصول مرتب ہو گئے۔ قوانین سے متعلق مسائل کے حل کی نئی راہیں کھلیں اور اس ضمن میں وکلاء میں یہ رجحان پیدا ہوا کہ وہ اسلامی قوانین میں بھی مہارت پیدا کریں اور ان کا علم حاصل کریں۔

ان عدالتوں کی ساخت، دائرہ کار اور حیثیت کے بارے میں بہت سی خامیاں موجود ہیں

لیکن اسے صحیح سمجھا جائے یا غلط، بنیادی مقصد یہ تھا کہ یہ نظام بتدریج نافذ کیا جائے اگر نیک نیتی سے کام لیا جائے تو اسلامی قوانین کے نفاذ کے مقصد کے لئے ان خامیوں کو دور کیا جاسکتا ہے اور اس نظام سے مطلوبہ ثمرات حاصل کئے جاسکتے ہیں۔

قرارداد مقاصد

اس مضمون کی ابتداء میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ قرارداد مقاصد اسلامی نظام کی طرف ایک تاریخی قدم تھا۔ یہ قرارداد دستور ساز اسمبلی نے 1949ء میں منظور کی تھی۔ اس قرارداد پر اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے مرحوم قائد ملت لیاقت علی خان نے کہا تھا۔

''میں اس واقعہ کو اس ملک کا نہایت اہم واقعہ سمجھتا ہوں، اہمیت کے اعتبار سے یہ آزادی کے حصول کے بعد اہم واقعہ ہے۔ ہمیں ملک کے حصول کا موقعہ اس لئے ملا تھا کہ ہم اپنے نظریات کے مطابق اس کا سیاسی نظام تشکیل کریں۔ میں ایوان کو یاد دلانا چاہوں گا کہ بابائے قوم قائداعظم نے ان جذبات کا اظہار متعدد مواقع پر کیا تھا اور پوری قوم نے پوری طرح ان کی تائید کی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ پاکستان اس لئے معرض وجود میں آیا کہ برصغیر کے مسلمان اسلام کی تعلیمات اور روایات کے مطابق اپنی زندگیاں ڈھال سکیں اور چونکہ وہ دنیا پر ثابت کرنا چاہتے تھے کہ اسلام دنیا کو پیش آمدہ متعدد بیماریوں اور مسائل کا حل پیش کرتا ہے''۔

ملک کے نامور ماہر قانون مسٹر اے۔ کے بروہی کے الفاظ میں یہ قرارداد پاکستان کے قانونی نظام کے بنیادی پتھر کی حیثیت رکھتی ہے۔ تاہم جب دستور بنایا گیا تو اس اہم دستاویز کو صرف اس کے دیباچے کے طور پر شامل کیا گیا اور اسے دستور کا قابل عمل اور موثر حصہ نہ بنایا گیا۔ چنانچہ اس کی قانونی حیثیت صرف دستور کی تشریح اور توضیح کے لئے رہنمائی کرنے تک محدود ہو گئی۔

ملک کی اعلیٰ عدالتوں نے متعدد مقدموں میں قرارداد مقاصد پر خیال آرائی کی ہے اور اہمیت کو واضح کیا ہے۔ مثال کے طور پر معروف عاصمہ جیلانی کیس میں جسٹس محمود الرحمٰن چیف جسٹس آف پاکستان نے فرمایا:

''ہمارا اپنا بنیادی اصول جو ہمارے اپنے عقیدہ سے مربوط ہے یہ ہے کہ کائنات کی حاکمیت تمام تر صرف اللہ تعالیٰ کی ہے اور عوام کا اللہ کی طرف سے متعین حدود کے اندر اختیار کا استعمال ایک مقدس امانت ہے۔ یہ ایک ناقابل تغیر و تبدل اصول ہے جسے قرارداد مقاصد میں واضح طور پر تسلیم کیا گیا ہے''۔

اسی مقدمہ میں جسٹس سجاد احمد جان نے اپنے فیصلے میں اس قرارداد کی اہمیت مزید پر زور طریقے سے واضح کی۔

''ہمارے بنیادی اصول ہمارے عقیدے سے اخذ کیے جاتے ہیں جو صرف ایک مذہب نہیں بلکہ ایک نظام حیات ہے۔ یہ اصول نہ تبدیل ہو سکتے ہیں اور نہ ہماری سیاسی ہئیت کو اس سے جدا کیا جا سکتا ہے''۔

پاکستان کی ریاست اسلامی نظریہ کی بنیاد پر وجود میں آئی اور اس سے دائمی طور پر وابستہ ہے اسے اسی نظریہ کے اصول کے مطابق چلانا ضروری ہے۔ جب تک خدانخواستہ پاکستان کا سیاسی ڈھانچہ دوبارہ غیر اسلامی انداز کا نہیں بنا دیا جاتا، جس کا صاف مطلب اس کے اصل تصور کی مکمل نفی ہوگا۔

قرارداد مقاصد مجرد روایتی دیباچہ نہیں۔ یہ پاکستان ک دستوری تصورات کی روح اور بنیادی اصولوں کا مرقع ہے۔

اگرچہ اعلیٰ عدالتوں نے قرارداد مقاصد کی اہمیت کے بارے میں پرزور خیالات ظاہر کئے

لیکن وہ یہ کہنے پر بھی مجبور تھے کہ چونکہ یہ محض دیباچے کی حیثیت رکھتی ہے اس لئے ملک کی قانون سازی پر حاوی نہیں ہوسکتی۔ چیف جسٹس آف پاکستان مسٹر جسٹس حمود الرحمان نے بعد ازاں ایک اور مقدمے (ضیاء الرحمان) میں اپنے عاصمہ جیلانی کیس کے فیصلے کی وضاحت اس طرح کی:

''میری رائے میں کوئی دستاویز کتنی ہی مقدس اور قابل احترام کیوں نہ ہو اگر اسے دستور میں شامل نہ کیا جائے یا وہ دستور کا حصہ نہ بنائی جائے تو دستور پر حاوی نہیں ہوسکتی۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہمارے دستوری نظام میں بھی 1949ء کی قرارداد مقاصد ایک ایسی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے جسے عموماً تسلیم کیا گیا ہے اور اسے کبھی نہ منسوخ کیا گیا ہے نہ ختم، دستور کی حیثیت نہیں رکھتی اور اس جیسی قانونی حیثیت کی حامل نہیں ہوسکتی جب تک اسے دستور میں شامل نہ کرلیا جائے یا دستور کا حصہ نہ بنا لیا جائے۔ جب تک وہ دیباچے کی حیثیت سے موجود ہے تو ان ہی مقاصد کے لئے کارآمد ہے جو کسی دیباچے کے ہوسکتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ اگر قانون سازی کرنے والوں کے مقاصد کے بارے میں کوئی اختلاف پیدا ہوجائے تو قرارداد مقاصد کی روشنی میں ان کے اصل مقاصد کا تعین کرلیا جائے۔ لیکن اس سے اصل قانون سازی کو کنٹرول کرنا ممکن نہیں''۔

یہ پس منظر تھا جس میں جنرل محمد ضیاء الحق نے ملک کو اسلامی نظام کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے ایک اور اہم قدم اٹھایا اور وہ یہ تھا کہ قرارداد مقاصد کو دستور کا لازمی جزو بنا کر اس کا حصہ قرار دیا گیا۔ اس مقصد کے پیش نظر 1985ء میں دفعہ 2-A اضافہ کیا گیا۔ یہ دفعہ اس طرح ہے۔

''قرارداد مقاصد میں پیش کئے گئے اصولوں اور ضابطے جو ضمیمہ میں شامل ہیں آج سے دستور کا

جزو لاینفک ہوں اور فوری طور پر اسی حیثیت کے حامل قرار پائیں گے''۔

اس ترمیم کا مدعا یہ تھا کہ قرارداد مقاصد کے دستوری مقام کے بارے میں جو کمی رہ گئی تھی، وہ دور کردی جائے کیونکہ سپریم کورٹ کی رائے میں اس کمی کی وجہ سے اس کی مکمل دستوری اہمیت کو بروئے کار نہیں لایا جاسکتا۔

دفعہ 2-A کے تحت بعض اعلیٰ عدالتوں نے کئی ایسے فیصلے صادر کئے ہیں جن کے مطابق یہ قرارداد دستور کا موقر حصہ ہونے کی بنا پر عدالتی دائرہ کار میں آ گئی ہے اور اس بنیاد پر قوانین کو جو اس قرارداد کے کسی جزو کی نفی کرتے ہیں کالعدم قرار دیئے جاسکتے ہیں اور ان میں ایسی ترامیم لازمی ٹھہرائی جاسکتی ہیں جو انہیں قرارداد کے مطابق بنا دیں۔ انہی فیصلوں کے ماتحت بعض غیر اسلامی قوانین کو غیر موثر ٹھہرایا گیا ہے اور متعلقہ مقدمات میں عام اسلامی قوانین کا اطلاق کیا گیا ہے۔

یہ مسئلہ ابھی آخری حل کا محتاج ہے اور عدلیہ میں مختلف سطحوں پر زیر بحث ہے۔ ابھی سپریم کورٹ نے 2-A دفعہ کی کوئی حتمی توضیح نہیں کی ہے اور اس کے عملی تقاضے طے کرنا باقی ہیں۔
تاہم تشریح اور توضیح کے نازک مسائل کو چھیڑے بغیر پورے یقین سے پیش گوئی کی جاسکتی ہے کہ قرارداد کی حیثیت میں سپریم کورٹ کے پہلے دیئے گئے فیصلوں کی روشنی میں جو تبدیلی کی گئی ہے وہ اس کو زیادہ وزن دے گی اور اس کے وہ اثرات مرتب ہوں گے جو پہلے موجود نہ تھے۔ قرارداد کی نئی حیثیت کی توضیح سے اس کے اصل مقاصد کے حصول میں مدد ملے گی۔ جن میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت پر یقین کامل کی بنا پر اسلامی نظام کی تشکیل شامل ہے۔

بینکنگ سسٹم میں تبدیلی

ملک میں اسلامی نظام کی ترویج کے سلسلے میں ایک اور تبدیلی جنرل ضیاء نے ملک کے بنکاری

نظام میں برپا کی۔

پہلے یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل نے ملکی معیشت کو سود سے پاک کرنے کے سلسلے میں ایک تفصیلی رپورٹ تیار کی تھی۔ حکومت نے اسے عملی شکل دینے کے لئے اپنی حکمت عملی ترتیب دی اور ہر کمرشل بینک میں پہلے نفع اور نقصان میں شرکت کے کھاتوں کا اجراء کیا (انہیں بالعموم پی۔ ایل۔ ایس اکاؤنٹ کہا جاتا ہے) دعویٰ یہ کیا گیا کہ ی سود سے پاک ہوں گے۔ اس بات کی اجازت دی گئی کہ دوسرے کھاتے روایتی طریقوں کے مطابق جاری رہیں اور ان پر کھلا سود ملے گا۔ کافی وقفہ کے بعد حکومت نے اعلان کیا کہ تمام موجودہ کھاتے بالآخر نفع اور نقصان میں شرکت کے کھاتوں میں بدل دیئے جائیں گے۔ ملکی اور غیر ملکی ہر قسم کے بنکوں کو سودی کھاتے چلانے کی ممانعت کر دی گئی اور سود کو کسی شکل میں حسابات میں شامل کرنا ممنوع ٹھہرا۔

ظاہر ہے کہ یہ معیشت کو اسلامی خطوط پر استوار کرنے کے لئے ایک انقلابی قدم تھا۔ بدقسمتی سے اس میں کچھ خرابیاں رہ گئیں اور یہ ان کی وجہ سے گیارہ برسوں میں اسلامی نظام کی طرف پیش رفت کا سب سے کمزور پہلو بن گیا۔

اس خرابی کی بنیادی وجہ ی تھی کہ نئے نظام کا منصوبہ بناتے وقت سارے سلسلہ کی شریعت کی روشنی میں نگہداشت کرنے اور اس کے نفاذ سے پیدا ہونے والی عملی مشکلات کے حل کے لئے کوئی بالاتر فورم تشکیل نہیں دیا گیا۔ سٹیٹ بنک نے سود کی بجائے بارہ مختلف طریقے متعارف کرائے لیکن ان کے بارے میں کوئی تفصیلی ہدایات نہیں دی گئیں۔

بنکوں نے ان تمام طریقوں کو اس طرح اپنایا کہ انہیں شریعت کے مطابق ڈھالنے کی کوشش نہ کی گئی نتیجہ یہ نکلا کہ اسلامی حلقوں، بالخصوص علماء نے اس نظام کو رد کر دیا۔ ان کی طرف سے

سخت تنقید سامنے آئی اور کہا گیا کہ نیا نظام صرف لفظوں کا ہیر پھیر ہے اور مالی لین دین میں سود بدستور موجود ہے جسے مارک اپ کا نام دے دیا گیا ہے۔

یہ تنقید بے جا نہ تھی۔ یہ نظام اسلامی نظریاتی کونسل اور اس کے نامزد کردہ ماہرین بنکاری اور معیشت کی سفارشات کے مطابق نہ تھا۔ تبدیلیاں بس اصلاحات میں کی گئیں اور سود کو حقیقی معنوں میں ختم کرنے کی کوئی کوشش نہ کی گئی لیکن ساری خامیوں اور کوتاہیوں کے باوجود یہ ماننا پڑے گا کہ پاکستان کی تاریخ میں بلکہ شاید پوری دنیائے اسلام کی تاریخ میں پہلی مرتبہ سود سے پاک بینکاری کا اصول سرکاری سطح پر تسلیم کیا گیا اور بنکوں کے سود کے جائز یا ناجائز ہونے کا تنازعہ ختم ہوگیا۔ سرکاری سطح پر تسلیم کر لیا گیا کہ اسلامی احکامات کے تحت سود ممنوع ہے، اسے ملک کی معیشت کی بنیاد نہیں بنایا جاسکتا۔

اب مسئلہ اس اصول کے عملی اطلاق کا رہ جاتا ہے اور یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ اگر حکومتی سطح پر اسلامی نظام کی طرف پیش قدمی جاری رہی تو اس اصول کے اطلاق میں جو کوتاہیاں ہوئی ہیں، مستقبل میں انہیں دور کیا جاسکے گا۔

یہ وہ بنیادی اقدام ہیں، جو حکومت نے ملکی قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لئے 1977ء سے 1988ء کے عرصے میں اٹھائے۔ یوں تو تعلیمی تنظیمی معاشرتی اور معاشی شعبوں میں بھی اس دور میں اسلامی نوعیت کی بہت سی اصلاحات ہوئیں لیکن زیر مطالعہ مضمون میں صرف ملکی قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لئے اٹھائے گئے اقدامات کا ذکر مطلوب تھا۔

یہ درست ہے کہ جن اقدامات کا ذکر کیا گیا، وہ خامیوں سے پاک نہ تھے اور اس بنا پر ان پر تنقید بھی کی گئی۔ پھر بھی غیر جانبداری سے جائزہ لیا جائے تو اس حقیقت سے صرف نظر ممکن

نہیں۔اس دور میں اس سمت میں جو پیش رفت ہوئی، اگر اس کا مقابلہ پچھلے 30 سالوں سے کیا جائے تو یہ بلاشبہ ایسے سنجیدہ، مثبت اور بامعنی مذاکرات تھے، جن کا ملک کو اس سے پہلے کوئی تجربہ نہ ہوا تھا۔

پاکستان کا ایٹمی پروگرام اور جنرل ضیاء الحق

زاھد ملک

اگر بہاولپور کا 17 اگست 1988ء کا سانحہ رونما نہ ہوتا تو پاکستان کے ایٹمی پروگرام کی تقدیر یقیناً مختلف ہوتی۔ یہ محض مصنف کی ذاتی رائے ہی نہیں ہے۔ مرحوم جنرل ضیاء الحق نے پاکستان کے ایٹمی پروگرام کی جو تفصیلات مرتب کی تھیں ان کے دقیق مطالعہ سے ہر شخص اسی نتیجے پر پہنچے گا۔

بہاولپور کا ہوائی حادثہ جس میں صدر ضیاء کو زندگی سے ہاتھ دھونا پڑے ابھی تک ایک معمہ ہے۔ عین ممکن ہے کہ تاریخ یہ ثابت کرے کہ یہ حادثہ اس سازش کا حصہ تھا، جس کے تحت پاکستان کو ایٹم بم بنانے اور اس کا تجربہ کرنے سے باز رکھنا مقصود تھا۔ ظاہر ہے کہ صدر ضیاء کو منظر عام سے ہٹا کر ہی یہ مقصد حاصل کیا جا سکتا تھا۔ یہ ان کی زندگی میں ممکن نہ تھا حالانکہ دنیا کے مختلف اہم مراکز سے ان پر اس مقصد کے لئے ہر طرح کا دباؤ ڈالا جا رہا تھا۔ اس تجربہ سے منطقی طور پر یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ پاکستان کو ایٹمی کلب سے باہر رکھنے کے لئے جنرل ضیاء کے وجود کا خاتمہ ضروری تھا۔

میں یہاں بحث کو پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے بڑے بڑے مقاصد تک محدود رکھوں گا جو جنرل ضیاء کی پالیسیوں کے عمومی مقاصد کے ایک اہم جزو کی حیثیت سے بروئے کار لائے گئے۔ جنرل ضیاء پاکستان کے ایٹمی پروگرام میں بعد میں شریک ہوئے۔ اس کی ابتداء تو ان کے پیش رو وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے کی تھی۔ تاہم جنرل ضیاء نے اس کے نہایت نازک اور فیصلہ کن مراحل کو عملی جامہ پہنایا حالانکہ اس کی شدید مخالفت نہ صرف اس وقت کی دو عالمی

طاقتوں یعنی روس اور امریکہ کی طرف سے ہو رہی تھی بلکہ بھارت اور اسرائیل کی دو طاقتور مخالف لابیاں بھی اس کے خلاف ریشہ دوانیوں میں مصروف تھیں۔ مرحوم صدر نے نہ صرف اس پروگرام کو عملی شکل دی بلکہ اسے ایک نئی جہت بھی عطا کی۔

پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے ابتدائی تشکیلی دور میں جنرل محمد ضیاء الحق کا پاکستانی افواج کے سربراہ کی حیثیت سے ڈاکٹر عبدالقدیر خان سے رابطہ ہوا جنہوں نے پاکستان کو دنیا کے ایٹمی نقشے پر ایک مقام عطا کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا تھا۔ ڈاکٹر قدیر نے ایٹمی افزودگی کے سنٹرل فیوگ نظام کی مہارت یورپ میں مختلف مناصب پر کام کر کے حاصل کی تھی۔ انہیں ایٹمی انشقاق کے اس نظام کے عملی تجربہ کے لئے اس وقت کی حکومت نے اسلام آباد کے نواح میں کہوٹہ لیبارٹریز قائم کرنے کا فرض سونپا تھا۔ یہ 1975ء تھا۔ جنرل ضیاء نے ان کی مدد کے لئے فوج کے دو اعلیٰ افسروں لیفٹیننٹ جنرل زاہد علی اکبر خان اور میجر جنرل انیس علی سید کی خدمات ڈاکٹر خاں کو پیش کر دیں تا کہ کہوٹہ ریسرچ لیبارٹریز کا بنیادی ڈھانچہ کم سے کم وقت میں تعمیر کر دیا جائے۔ اس وقت یہ فوج کے سربراہ کی طرف سے ایک ممتاز سائنس دان کے لئے معمول کی مدد سمجھی جا سکتی تھی۔ کسے خبر تھی کہ تین سال بعد یہی جنرل ضیاء صدر ریاست کی حیثیت سے انہی لیبارٹریز کی کارکردگی کی بنیاد پر قوم کے ایٹمی پروگرام کی نئی راہیں متعین کریں گے۔

پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے جنرل ضیاء الحق کی براہ راست سرگرمی میں ارتقاء پر گفتگو کرنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ وہ اس بارے میں کن خیالات کے حامل تھے اور انہوں نے کس طرح دنیا بھر کی مخالفت کے باوجود اسے پروان چڑھایا۔ بعض علاقوں میں اس خیال کا اظہار کیا جاتا ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو کو سیاسی منظر سے ہٹایا ہی اسی لئے گیا تھا تا کہ پاکستان کو ایٹمی پروگرام سے باز رکھا جائے۔ مسٹر بھٹو پاکستان کے لئے ایٹم بم بنانے کے بارے میں

بہت کھل کر اظہار خیال کرتے تھے۔ اگر یہ درست ہو تو پھر ان کے جانشین جنرل ضیاء الحق سے توقع ہوگی کہ وہ اس پروگرام کے بارے میں مخالف پاکستان لابیوں یک خواہشات کی تکمیل کریں گے۔ لیکن تاریخ کی شہادت اس کے برعکس نکلی۔ جنرل ضیاء نہایت خاموشی سے اس پروگرام کو اس کے منطقی انجام تک پہنچانے میں جت گئے۔

بیرونی دنیا کو پاکستان کے حقیقی ایٹمی پروگرام کی خبر ہونے سے بہت پہلے جنرل ضیاء کو فرانس کے ری پراسسنگ پلانٹ کے مسئلہ کی وجہ سے امریکی امداد پر پابندی کا سامنا کرنا پڑا۔ دنیا بھر میں اس پر خاصا ہنگامہ برپا ہوا۔ اس وقت دنیا کی توجہ ری پراسسنگ پلانٹ پر مرکوز تھی اور اس طرح پاکستان کا ایٹمی پروگرام جو ابتدائی مراحل میں تھا اور کہوٹہ میں خفیہ طور پر پروان چڑھ رہا تھا دنیا کی نظروں سے اوجھل رہا۔ اس مرحلہ پر جنرل ضیاء نے اپنی تمام تر توجہ اس پروگرام کے لئے کہوٹہ پلانٹ کی تکمیل پر مرکوز رکھی اور ڈاکٹر اے کیو خان کو ہر ممکن مدد فراہم کی۔

یہاں جنرل ضیاء کے ایٹمی پروگرام کی طرف رجحان پر کچھ روشنی ڈالنا ضروری ہے۔ عام طور پر ایک فوجی جنرل جو ملکی معاملات کا سربراہ بھی ہو یہ کوشش کرے گا کہ ممکنہ اعدا کے مقابلے میں فوجی برتری حاصل کرے۔ جنرل ضیاء اس سے مستثنٰی نہ تھے لیکن ایٹمی توانائی کے حصول کے لئے ان کے سامنے کچھ اور عوامل بھی تھے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ دوقومی نظریہ پر یقین رکھنے والا ہر سچا پاکستانی جو اسے پاکستان کی بنیاد قرار دیتا ہو محسوس کرتا ہے کہ پاکستان سیاسی اور فوجی طور پر بھارت کا مدمقابل بن کر ہی قائم رہ سکتا ہے۔ جنرل ضیاء اس تصور میں خلوص سے یقین رکھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ بھارت کے 1974ء کے ایٹمی دھماکے کے بعد مقابلے کی مزاحمتی فوجی طاقت کے بغیر پاکستان وجودی خطرے میں رہے گا۔ اس مقصد کے لئے بھارت سے بہتر نہ سہی کم از کم مقابلے کی ایٹمی صلاحیت حاصل کرنا ضروری تھا۔ ضمناً یہ بتا دیا جائے کہ پاکستان کی

ایٹمی صلاحیت جو سنٹرل فیوگ سسٹم سے حاصل ہوئی ہے بھارت کی روایتی ایٹمی صلاحیت سے بہت بہتر ہے۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ جنرل ضیاء اسلام کے احیاء کے بی علمبردار تھے جس کا خواب ہمارے قومی مفکراور شاعر علامہ اقبال نے دیکھا تھا۔دور جدید میں اس احیاء کے لئے سائنسی ارتقاء ایک لازمی شرط ہے۔ جنرل ضیاء کی تمنا تھی کہ پاکستان اس موڑ پر پوری اسلامی دنیا کی رہنمائی کرے۔ جنرل ضیاء کو عمومی انداز میں فلسفیانہ سطح پر اور بالخصوص ایٹمی سائنسی ترقی کی سطح بلند کرنے کی بنا پر علامہ اقبال کے تصوراتی ''مردمومن'' (جو جرمن فلسفہ کے ''سپر مین'' اور فرانسیسی تصورات کے Elan Vital کا اسلامی عکس ہے) کے مصداق سمجھا جاتا ہے۔

جنرل ضیاء اسلامی تہذیب کو ایٹمی صلاحیت سے مالا مال دیکھنا چاہتے تھے اور انہوں نے پاکستان کے لئے ایٹمی صلاحیت حاصل کر کے اپنے اس خواب کو عملی جامہ پہنا دیا۔انہوں نے اس تصور کو عملی شکل اس طرح دی ہے کہ نسبتاً بالاتر ٹیکنالوجی کے لئے آج اسلامی ممالک پاکستان سے استعانت کے طلب گار ہوتے ہیں۔ان کے اس کردار کا اعتراف اس طرح کیا گیا کہ انہیں اسلامی کانفرنس کی سائنٹفک کمیٹی کا چیئر مین بنایا گیا۔

یہ بات یادرکھنے کے قابلہ ے کہ کسی چیز کا خواب دیکھنا دوسری بات ہے اور اسے عملی جامہ پہنانا بالکل مختلف کام ہوتا ہے۔کہا جاسکتا ہے کہ جس طرح پاکستانی روایتی طریقوں سے ہٹ کر نہایت برتر ٹیکنالوجی کے تحت سنٹرل فیوگ سسٹم سے یورانیم کی افزودگی کا کارنامہ سرانجام دینا ایک معجزہ ہے اسی طرح اس کا اس سلسلے مس ی دنیا بھر کی مخالفت کا سامنا کرنا بھی معجزہ سے کم نہیں۔ پاکستان کے ایٹمی پروگرام کی مخالفت جن تین مختلف محاذوں پر ہوئی وہ تینوں بہت خطرناک حیثیت رکھتے تھے۔ان مس ی سے ایک محاذ عالمی ذرائع ابلاغ کی طرف پاکستان کے

ایٹمی پروگرام کے خلاف دشمن اور اسلام دشمن انداز میں بھرپور مہم چلانا تھا۔ دوسرا محاذ بین الاقوامی اداروں اور تنظیموں میں پاکستان کو ایٹمی عدم پھیلاؤ کے معاہدے پر دستخط کرنے سے انکار کی بنا پر مذمت کا نشانہ بنانا تھا اور تیسرا محاذ یہ تھا کہ اس پروگرام کا بہانہ بنا کر پاکستان کی ہر طرح کی مدد بند کردی جائے۔

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے خلاف مہم فرانس کی موعودہ ری پراسسنگ پلانٹ کی بنا پر شروع کی گئی جس سے بعد میں فرانس نے انکار کردیا۔

یہ وہ مرحلہ تھا جب خفیہ طور پر کہوٹہ میں ابتدائی ڈھانچے اور افزودگی کے سلسلے میں کام شروع ہو چکا تھا۔ یہ کام زیادہ دیر خفیہ نہ رہ سکا۔ اس کا راز ایک برطانوی فرم ایمرسن الیکٹرک کمپنی سے کھلا جسے پاکستان نے ترقی یافتہ انونٹرز (Inventor) بنانے کا آرڈر دیا اور ان کی مخصوص تشریحات اور نمونے پاکستان نے خود مہیا کئے تھے۔ ان سے مغرب کو پاکستان کے ایٹمی پروگرام کی بھنک پڑگئی اور پورا مغربی پریس جس کی رہنمائی Nucleonics Week کر رہا تھا پاکستان پر ٹوٹ پڑا۔ دوسرے مغربی اخبار جو اس سلسلے میں پیش پیش تھے ان میں جرمنی کا DER SPEIGEL' لندن کا آبزرور اور انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹریبیون، کرسچین سائنس مانیٹر نیویارک ٹائمنز اور فنانشل ٹائمنز شامل تھے۔ اس کے بعد اسلامی بم کے عنوان سے ایک کتاب منظر عام پر آئی اور بی بی سی نے پراجیکٹ 706 اسلامک بم کے نام سے اپنے پروگرام پینو راما میں ایک فلم کی نمائش کی جس میں پاکستان کے ایٹم بم کو ایک خوفناک انداز میں پیش کیا گیا۔

پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے خلاف پروپیگنڈے کی بنا پر مغرب سے پاکستان کے تعلقات بری طرح متاثر ہوئے۔ اسرائیل کی انگیخت پر ان اخباری رپورٹوں کو بنیاد بنا کر ڈاکٹر عبدالقدیر خان پر ہالینڈ میں ایٹمی معلومات چرانے کے الزام کے تحت ایک مقدمہ قائم کر دیا گیا۔ اس

مقدمہ میں بہت سی قانونی پیچیدگیاں تھیں اور جنرل ضیاء کی حکومت پر اس سلسلے میں اخلاقی ذمہ داری بھی عائد ہوتی تھی کیونکہ ڈاکٹر قدیر اس کے ملازم تھے۔ جنرل ضیاء کی حکومت سخت نفسیاتی دباؤ میں آ گئی۔ ہیگ کی عدالت میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی اپیل کی پرزور پیروی کی گئی جنرل ضیاء کی کامیاب ڈپلومیسی اور ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی برأت سے دباؤ میں کمی ہوئی۔ لیکن اس دوران مغربی مارکیٹوں میں ایٹمی ٹیکنالوجی سے تعلق رکھنے والے ہر قسم کے سازوسامان کی فروخت پر پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ علاوہ ازیں مغربی ممالک بالخصوص کینیڈا اور امریکہ میں متعدد لوگوں کے خلاف اس الزام میں مقدمات درج کئے گئے کہ وہ ایسا مواد سمگل کرنے میں ملوث تھے جو مبینہ طور پر کہوٹہ ریسرچ لیبارٹریز میں استعمال ہو سکتا تھا۔ صدر ضیاء نے نہایت جرأت کے ساتھ اس نفسیاتی اور ڈپلومیٹک دباؤ کا مقابلہ کیا۔ انہیں کسی طرح بھی ایٹمی توانائی کے حصول کے راستے پر چلنے سے باز نہیں رکھا جا سکتا تھا۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ جنرل ضیاء پر ہر قسم کے موجود ایوانوں میں ایٹمی پھیلاؤ روکنے کے معاہدے پر دستخط کرنے کے لئے دباؤ ڈالا جاتا رہا۔ امریکہ ان ملکوں کی قیادت کر رہا تھا جو اس دباؤ کے ذمہ دار تھے۔ جب بھی اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں یہ موضوع زیر بحث آتا امریکی، بھارت اور اسرائیلی لابیوں کے تعاون سے پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے خلاف ہر طرح کا شور شراب برپا کر دیتے۔ مغربی پریس میں نت نئی کہانیاں جگہ پاتیں۔ جب بھی پاکستان کے لئے کسی نوعیت کی امریکی امداد کا مسئلہ زیر بحث آتا تو یہ دباؤ سامنے آ جاتا۔ جب کارٹر انتظامیہ نے 1979ء میں امریکی امداد بند کی تو پاکستان نے ایٹمی پھیلاؤ روکنے کے معاہدے پر دستخط کرنے کے لئے کہا گیا۔ 1981ء میں 3.2 ملین ڈالر کی امریکی امداد کے پانچ سالہ پیکج کو بحال کرتے وقت بھی اس معاہدہ پر دستخط کرنے کے لئے پھر یہ دباؤ ڈالا گیا۔ حالانکہ افغانستان

پر روسی جارحیت کی بنا پر صورت حال بدل چکی تھی، جب 1987ء کے بعد کا 4.02 بلین ڈالر کا امدادی پیکج امریکی کانگریس کے سامنے رکھا گیا تو ایک مرتبہ پھر یہ دباؤ سامنے آیا۔ اس مؤخر الذکر صورت میں تو پاکستان میں اس دور کے امریکی سفیر مسٹر ڈین ہنٹن نے انسٹی ٹیوٹ آف سٹریٹجک اسٹڈیز میں اپنی مشہور تقریر میں پاکستان کو دھمکی دی کہ اگر اس معاہدہ پر دستخط نہ کیے گئے تو امریکہ یہ امداد منظور نہ کرے گا۔

جنرل ضیاء نے اس دباؤ کا مقابلہ اپنے مخصوص شریفانہ لیکن ثابت قدمی کے انداز میں کیا۔ ایک طرف ان کے وزیر خارجہ اقوام متحدہ کے ایوانوں میں ایٹمی پھیلاؤ کو روکنے کی نہایت معنی خیز وکالت کر رہے تھے تو دوسری طرف خود اکثر نہایت کامیاب انداز میں پاکستان کے ایٹمی پروگرام کو بھارت کے ایٹمی پروگرام کے ساتھ نتھی کر رہے تھے۔ انہوں نے 1985ء میں ایٹمی عدم پھیلاؤ کے معاہدے پر دستخط کرنے کی جو مشروط پیشکش کی تھی اس کا عالمی ایوانوں میں اکثر تذکرہ کیا جاتا رہا۔ انہوں نے شرط عائد کی کہ اگر بھارت اس معاہدہ پر دستخط کر دے تو انہیں بھی اسپر کوئی تامل نہ ہ گا۔ بالکل امر واقعہ یہ ہے ان کی اس موضوع پر پیش کردہ پانچ نکاتی تجویز پاکستان پر اس معاہدہ پر دستخط کرنے کے دباؤ کا عملی جواب ثابت ہوئی۔ انہوں نے تجویز پیش کی کہ:

1۔ جنوبی ایشیاء کو ایٹمی ہتھیاروں سے پاک علاقہ قرار دیا جائے۔

2۔ بھارت اور پاکستان بیک وقت ایٹمی عدم پھیلاؤ کے معاہدے پر دستخط کر دیں۔

3۔ وہ عدم پھیلاؤ کے ایک دوطرفہ معاہدے پر بھی دستخط کریں۔

4۔ وہ ایک بین الاقوامی معائنہ ٹیم پر اتفاق کریں جو دونوں ممالک کے تمام ایٹمی مراکز میں جا کر ان کا معائنہ کرے۔

5۔وہ ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال سے برأت کا اظہار کریں۔

اس تجویز نے پاکستان پر ایٹمی عدم پھیلاؤ کے معاہدے پر دستخط کرنے کے دباؤ کے غبارے سے ہوا نکال دی۔لیکن امریکہ میں پاکستان کے خلاف ایٹمی پروگرام ترک کرنے کے لئے امداد کا ہتھیار استعمال کیا جاتا رہا اس مقصد کے لئے ایک طاقتور لابی کو اجرت پر تیار کیا گیا تاکہ جب بھی امریکن کانگریس یا سینٹ میں پاکستان کے لئے امریکی امداد کا مسئلہ اٹھایا جائے تو وہ پاکستان کے ایٹمی پروگرام کی ڈفلی بجانا شروع کردے۔ان لوگوں میں چند بڑے نام شامل تھے مثلاً سینٹ کی فارن ریلیشنز کمیٹی کے صدر بھی ان میں شامل تھے۔

صدر ضیاء نے اس قسم کے دباؤ کی ہر نوعیت کا بے مثال سوجھ بوجھ سے مقابلہ کیا۔کہوٹہ لیبارٹریز کی کامیابیوں کے بارے میں بھی ان کے ماہرانہ انداز نے پاکستان مخالف لابیوں کے شر سے پاکستان کو محفوظ رکھا۔تین مواقع پر انہوں نے پاکستان کی ایٹمی صلاحیت کا اعتراف کیا۔پہلی مرتبہ کلکتہ کے اخبار سنڈے ٹائمز سے ایک انٹرویو میں دوسری مرتبہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے دفاع میں جب انہوں نے روزنامہ نوائے وقت سے ایک انٹرویو میں پہلی مرتبہ کہوٹہ ریسرچ لیبارٹریز میں ایٹمی مہارت کے حصول کی پیشہ ورانہ تفصیلات بیان کیں اور تیسرا موقعہ وہ تھا جب انہوں نے مارچ 1987ء میں مشہور ٹائم میگزین کو انٹرویو دیا اور جس کے بعد انٹرویو لینے والے نے یہ نتیجہ نکالا کہ ”پاکستان جب چاہے ایٹم بم بنا سکتا ہے“۔

ساتھ ہی ساتھ جنرل ضیاء کی توجہ اس پر مرکوز رہی کہ کہوٹہ میں کیا بن رہا ہے۔پہلے یہ ذکر ہو چکا ہے کہ جنرل ضیاء کا کہوٹہ پلانٹ سے تعارف اس وقت ہوا جب وہ آرمی چیف کے عہدے پر فائز تھے۔اقتدار سنبھالنے کے بعد انہوں نے ہر طرح کے وسائل ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو پیش کر دیئے۔اس دور کے وزیر خارجہ آغا شاہی اور وزیر مالیات غلام اسحاق خان (موجودہ صدر

پاکستان) کو ہدایت کی گئی کہ وہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی ہر ممکن مدد کریں۔لیکن پاکستان کے ایٹمی پروگرام سے ان کے قلبی تعلق کا آغاز 1978ء میں ہوا جب ڈاکٹر خان نے غلام اسحاق خان کو ایک رپورٹ پیش کی، جس میں سنٹری فیوگ طریقے سے ایٹم سے افزودگی کے بارے میں ان کی ابتدائی کامیابیوں کا تذکرہ تھا۔غلام اسحاق خان نے یہ رپورٹ جنرل ضیاء کی خدمت میں بھیج دی جنہوں نے ڈاکٹر خان کے کام کی تعریف کی اور اس دن کو پاکستان کی تاریخ کا اہم ترین دن قرار پایا۔1981ء میں انہوں نے کہوٹہ ریسرچ لیبارٹریز کا دورہ کیا ان کا نام ڈاکٹر اے کیو خان کے نام پر رکھ دیا جو ایک زندہ سائنس دان کے لئے منفرد اعزاز ہے۔انہوں نے اس موقع پر کہا کہ وہ اس پروگرام کو اس کے منطقی انجام تک پہنچا کر دم لیں گے۔اسی کے ساتھ انہوں نے اس پلانٹ کو ہوائی حملوں سے محفوظ رکھنے کے اقدامات بھی کئے کیونکہ جس انداز میں اسرائیل نے عراق کے ایٹمی پلانٹ کو تباہ کیا تھا اسی انداز کے حملوں کا خطرہ متعدد بار محسوس کیا جا چکا تھا اور اس کے بارے میں دھمکیاں بھی سامنے آ چکی تھیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا جنرل ضیاء صرف ایٹمی صلاحیت کے حصول پر اکتفا کرنا چاہتے تھے؟ بہت سے لوگوں کا اندازہ تھا کہ پاکستان کے پاس صرف صلاحیت ہی نہیں بم بھی موجود تھے اور مختلف جگہوں پر ان کے تجربے کا بھی سوچا جا رہا تھا۔ان اندازوں کی صداقت کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔لیکن یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ جنرل ضیاء اس سمت میں کوئی غیر معمولی فیصلہ کرنے والے تھے۔افغانستان کے بارے میں جنیوا معاہدہ ہو جانے کے بعد وہ اس سلسلے میں اپنے آپ کو زیادہ آزاد محسوس کرنے لگے تھے۔یہ مرحلہ نومبر 1988ء کے انتخابات کے بعد آ سکتا تھا۔جس کا اعلان انہوں نے بہاولپور کے حادثہ میں اپنی شہادت سے پہلے کر دیا تھا۔17 اگست کے حادثے نے وہ موقعہ چھین لیا جس کا جنرل ضیاء کو انتظار تھا۔

جنرل ضیاء کے بعد بے نظیر بھٹو کی موجودہ حکومت نے ایٹمی پروگرام اور حکمت عملی میں کیا تبدیلی کی ہے یا اس کا رخ کس حد تک موڑا ہے یہ ہمارے اس مضمون کے موضوع سے خارج ہے۔

یہ تھے جنرل ضیاء الحق

میجر محمد عامر

یہ 1978ء کی بات ہے۔ میں انٹرسروسز انٹیلی جنس سرگودھا کا آفیسر کمانڈنگ تھا۔ جنرل ضیاء الحق ڈسٹرکٹ کونسل ہال سرگودھا میں کھلی کچہری سے مخاطب تھے۔ حاضرین میں سے ایک جوان لڑکی اٹھ کھڑی ہوئی اور نہایت توہین آمیز انداز سے جنرل صاحب کو برا بھلا کہنے لگی۔ بعد کی معلومات کے مطابق منکشف ہوا کہ لڑکی کا تعلق پیپلز پارٹی سے تھا اور اسے کچھ لوگوں نے اسی مقصد کے لئے بھیجا تھا۔ تاہم جب لڑکی زیادہ چلا کر بولنے لگی تو جنرل صاحب نے اسے پاس بلا کر اپنے سامنے بٹھایا۔ جونہی لڑکی نے اپنی نشست سنبھالی، جنرل صاحب نے اس کے سر پر مشفقانہ انداز میں ہاتھ پھیرا اور ایک ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا کہ ''بیٹا!

You are very courageous, you should have been the Army.

ان کے اس فقرے کے ساتھ ہی ہال قہقہوں سے گونجنے لگا۔ لڑکی کو سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی کہ وہ اب کس راستے سے باہر نکلے۔

کھلی کچہری کے اختتام پر کچھ اخبار نویس سوالات کرنے لگے۔ ان دنوں نیوکلیئر پلانٹ کے حوالے سے فرانس پر بہت دباؤ پڑ رہا تھا۔ مذکورہ پلانٹ کے معاہدے کی متوقع منسوخی کے بارے میں ایک نامہ نگار نے اندیشے کا اظہار کیا تو جنرل صاحب یکدم سنجیدہ ہو گئے اور نامہ نگار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگے:

We The Army people hope for the best and prepa

for the worst.

”آپ لوگ اطمینان رکھیں۔انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا“۔

میں اس رات بستر پر لیٹا تو میرے ذہن پر انہی دونوں واقعات کا مکمل قبضہ تھا۔ میں ان واقعات کے پیچھے اس پراسرار شخص کی شخصیت کے نمایاں پہلو تلاش کر رہا تھا۔ جنہیں آج میں نے پہلی بار قریب سے دیکھا تھا۔ جن سے آج پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ میرے ذاتی تجربے اور مشاہدے کا خلاصہ یہ تھا کہ لڑکی کی صورت میں ایک مستقل حریف سے وہ جس طرح نپٹے، وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ شخص اپنے اعصاب کبھی بھی اپنے دشمن کے حوالے نہیں کرتا۔ حریف کا سامنا کرتے وقت وہ اپنے آپ کو جس خطرناک ہتھیار سے مسلح رکھتا ہے، وہ ان کی ناقابل یقین قوت برداشت ہے۔ نیوکلیئر پلانٹ کے حوالے سے انہوں نے جو جواب دیا، وہ بے مثال عزم اور مکمل یقین سے عبارت تھا۔ وہ عزم اور یقین جو اقبال کے مرد مومن کا خاصہ ہے۔ وہ بعد میں مرد مومن کہلائے تو بجا کہلائے۔

افغانستان میں روسی گھس آئے تو ان دنوں میری تعیناتی پہلے راولپنڈی اور بعد ازاں آئی۔ ایس۔ آئی اسلام آباد کے سربراہ کی حیثیت سے ہوئی۔ میں نے اس دوران جنرل ضیاء کو بہت قریب سے دیکھا۔ ان کی ساری جنگی حکمت عملی کی عمارت انہی دو ستونوں پر کھڑی نظر آئی جو چند سال پہلے سرگودھا میں ان سے پہلی ملاقات میں میری نظر نے ڈھونڈ لئے تھے۔ بے پناہ قوت برداشت اور بے مثال عزم و یقین...... یہ محض جنرل ضیاء اور ان کے چاہنے والوں کا ہی نہیں، ساری پاکستانی قوم کا بالخصوص اور امت مسلمہ کا بالعموم ایک المیہ ہے کہ جو کچھ کہا اور لکھا گیا، وہ اس جنرل ضیاء کے بارے میں تھا جو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر تھا اور جو ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی اور اس کی جماعت سے وابستہ کارکنوں کو فوجی عدالتوں سے سزا دلوانے کے حوالے

سے مطعون تھا۔ پاکستان میں کوئی بھی حکمران رہا ہو، ڈیموکریٹ، فوجی آمر یا نیم فوجی حکومت کا سربراہ، سیاسی مخالفین کے ساتھ سلوک کے حوالے سے کسی کے حصے میں بھی نیک نامی نہیں آئی مگر ضیاء الحق تو صرف پاکستان کا حکمران نہیں تھا۔ وہ پاک فوج کا سربراہ بھی تھا۔ میرا تعلق اسی جنرل ضیاء الحق سے رہا ہے جو سپہ سالار تھا اور جس نے اس حیثیت میں عالم اسلام کو وہ انمول تاریخ بنا کر دی، جس کے ایک ایک ورق پر بکھری ہوئی ہر داستان آنے والے وقت کی مائیں اگر چاہیں تو بچوں کی لوریوں کی صورت میں سناتی رہیں گی، گنگناتی رہیں گی۔

میں اس جنرل ضیاء کو جانتا ہوں، جس نے گھیراؤ کی کیفیت میں بھی تاریخ کی سب سے بڑی خفیہ اور گوریلا جنگ لڑی۔ جس نے انہی حالات میں خطے کی، تاریخ کی سب سے بڑی دہشت گردنیٹ ورک کا سامنا کیا اور جو بیک وقت مشرق اور مغرب دونوں سمتوں سے دشمنوں کے حصار میں تھا۔ مگر اس نے نہ صرف دونوں طرف کے اس حصار کو توڑا بلکہ حصار بنانے والوں میں سے بھی کچھ کو توڑا، کچھ کو توڑنے کے قریب لے گیا۔ انتہائی نامساعد حالات میں بھی وہ سب کو روندتا، کچلتا آگے بڑھا۔

آج سے کئی سال پہلے ویت نام میں ایک سپر پاور امریکہ نے اپنی عسکری قوت کے بل بوتے پر ایک پٹھو حکومت مسلط کر دی۔ ویت نامی اس پٹھو حکومت کے خلاف جنگ آزادی لڑنے نکلے تو انہیں امریکہ کے دشمن دوسری سپر پاور سوویت یونین کی حمایت حاصل ہوگئی۔ روسی امداد انہیں سرحد پر واقع ایک اور ملک چین کے ذریعے پہنچنے لگی۔ ادیبوں ارو دانشوروں نے ویت نامیوں کے حق میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے۔ ہوچی منہ نظموں، گیتوں، افسانوں اور کہانیوں کا عنوان بن گیا۔ آج بھی ہوچی منہ اور ویت نامی ان کے ہیرو ہیں۔ انہی کے تذکرے آج بھی ہو رہے ہیں...... مگر افغانستان میں کیا ہوا؟......

یہاں بھی تو وہی صورت حال تھی۔ صرف کردار بدل گئے۔ ویت نام میں جو کردار امریکہ کا تھا، وہ یہاں روس کا تھا۔ وہاں جو کردار روس کا تھا، وہ یہاں امریکہ کے حصے میں آیا اور جو کچھ وہاں چین کر رہا تھا، اس پر یہاں پاکستان کاربند تھا۔ مگر یہاں دانشوروں کے معیار اور اصول بدل گئے۔ کہا گیا کہ یہ امریکہ اور روس کی جنگ ہے۔ ویت نام میں بھی تو امریکہ اور روس نبرد آزما تھے۔ اس جنگ کو کیوں یہ نام نہ دیا گیا۔ اصل بات یہ تھی کہ افغانستان کی سرزمین پر لڑی جانے والی جنگ چونکہ مسلمان لڑ رہے تھے، چونکہ یہ عالم اسلام کی عظمت کی جنگ تھی، چونکہ یہ صرف افغانستان کی آزادی ہی کی نہیں پاکستان کے دفاع کی بھی جنگ تھی اور چونکہ اس جنگ کے سپہ سالار ہوچی منہ نہیں پاکستانی فوج کے سربراہ جنرل ضیاء تھے۔ اسی لئے یہ گالی بن گئی اور یہی ہماری تاریخ کے المیوں کا وہ سلسلہ ہے، جو ہمیشہ سے جاری ہے۔ کاش کوئی اس جنگ کا تجزیہ اسی آنکھ سے کرے، جس سے ویت نام کی جنگ کا کیا تھا تو تاریخ جان جائے گی کہ جنرل ضیاء اس صدی کا کس قدر خطرناک مسلمان جرنیل تھا۔ معلوم ہو جاتا کہ ہوچی منہ ان کے مقابلے میں محض ایک بونا تھا۔

1992ء میں ڈائریکٹر امیگریشن کی حیثیت سے پی آئی اے اور سول ایوی ایشن کے اعلیٰ حکام کے ساتھ میں تاشقند پی آئی اے کی پروازوں کا معاہدہ کرنے جا رہا تھا۔ جہاز میں میرے ساتھ والی نشست پر پی آئی اے کے ایک سینئر افسر بیٹھے تھے۔ وہ مجھے کہنے لگے میجر صاحب آپ مجھے بہت Excited لگ رہے ہیں، کیا وجہ ہے؟ میں نے انہیں بتایا کہ مجھے یخواب سا محسوس ہو رہا ہے کہ میں اس تاشقند کے ہوائی اڈے پر اترنے والا ہوں جو اب سوویت یونین کا شہر نہیں بلکہ ایک آزاد مسلمان مملکت کا دارالخلافہ ہے۔ یہ سب کچھ ہماری زندگی میں وقوع پذیر ہوگا۔ مجھے اس کا یقین نہیں تھا۔ پھر میں نے انہیں یہ واقعہ سنایا کہ "یہ روسی افواج کے افغانستان

دو دن کے بعد نورالمومن خان کابل سے لندن واپس آئے تو سیدھے میرے گھر تشریف لائے اور بولے کہ آزاد صاحب نے کہا ہے کہ بھارت اور پاکستان کے درمیان جنگ شروع ہو چکی ہے اور کلکتہ میں بنگلہ دیش کی جلاوطن حکومت حقیقتاً مسز اندرا گاندھی کی قیدی بن چکی ہے اور اب وہ اگر چاہیں بھی تو لندن نہیں آسکتے۔ لیکن ترپ کا پتہ یعنی شیخ مجیب الرحمٰن تو حکومت پاکستان کی قید میں لائل پور (حال فیصل آباد) جیل میں ہے۔ اگر یحییٰ خان اب بھی بات کرنے کو تیار ہیں تو آپ خود پاکستان جا کر شیخ مجیب الرحمٰن سے ملیں اور انہیں تمام صورت حال سے آگاہ کریں۔ کیونکہ اب بھی اگر حکومت پاکستان شیخ صاحب سے بات کرنے کے بعد انہیں پاکستان ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر لا کران سے اعلان کروادے کہ عوامی لیگ اور جنرل یحییٰ خان کے درمیان سمجھوتہ ہو گیا ہے اس لئے تمام بھارتی فوجیں مشرقی پاکستان سے واپس بھارت چلی جائیں تو اندرا گاندھی کے پاس اپنی فوجیں واپس بلانے کے علاوہ کوئی دوسرا چارہ کار نہیں رہے گا۔ چنانچہ میں نے اسی وقت غالباً 10 دسمبر 1971ء کو یہ پیغام بھی جنرل یوسف صاحب کو دے دیا۔ لندن میں روزانہ ٹیلی ویژن پر مشرقی پاکستان کے اندر بھارتی فوجوں کی پیش قدمی کی تصویریں دکھائی جارہی تھیں اور ہم سخت بے چینی کے ساتھ حکومت پاکستان کے پیغام کا انتظار کر رہے تھے۔ لیکن افسوس کہ وقت تیزی سے گزر گیا۔ جنرل یحییٰ خان کے ڈپٹی پرائم منسٹر اور وزیر خارجہ کی حیثیت سے ذوالفقار علی بھٹو نیویارک چلے گئے اور وہاں یو این او کے اجلاس میں پولینڈ کی پیش کردہ جنگ بندی کی قرارداد پھاڑ ڈالی اور بھارت سے ہزار سال جنگ جاری رکھنے کی ڈینگیں ہانک کر واپس آگئے یہاں تک کہ 16 دسمبر 1971ء کو مشرقی کمانڈ کے پاکستانی فوجیوں کے کمانڈر جنرل نیازی نے بھارتی فوجوں کے جرنیل جنرل اروڑہ کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور قائداعظمؒ کا پاکستان دو ٹکڑے ہو گیا۔

(16 دسمبر 1997ء)

wanted to push them accross."

اب وہی افسر مجھ سے بھی زیادہ Excited لگ رہا تھا۔

مجھے اس لمحے افسردگی نے آ گھیرا...... کاش میرے ساتھ وہ جادوگر وہ دیومالائی شخص بھی آج یہ منظر دیکھنے کے لئے زندہ ہوتا۔

ایک دن جنرل ضیاء اپنے کچھ قریبی لوگوں کے ساتھ بیٹھے معمول کی گپ شپ میں مصروف تھا۔ ڈاکٹر بشارت الٰہی کہنے لگے ''جنرل صاحب! روس ایک سپر پاور ہے۔ ہم ان سے کہاں ٹکر لے سکتے ہیں۔ یہ آپ ہمیں کس آگ میں جھونک رہے ہیں''۔ جنرل اچانک سنجیدہ ہو گئے اور بلاسوچے سمجھے ہاتھ کہ مکہ بنا کر ہوا میں دو تین بار لہرایا اور کہا ''ڈاکٹر صاحب! میں روس کو نتھ ڈال دوں گا''۔ کیا یقین کی دولت سے محروم شخص ایسی بات کر سکتا ہے؟ روس کو افغانستان میں نتھ ڈالنے کا فیصلہ جنرل ضیاء نے اس وقت کیا، جب افغانوں کے پاس آدم خیل کی بنی ہوئی بیکار بندوقوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ امریکہ کے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ روس کو افغانستسان میں ہزیمت سے دوچار کیا جا سکتا ہے۔ وہ تو دو سال بعد کہیں جاگ گئے جب دیکھا کہ جنرل ضیاء انہیں درہ آدم خیل کی بوسیدہ بندوقوں اور پھٹے کپڑوں میں ملبوس افغانوں کے ذریعے نتھ ڈال چکے ہیں۔

ویت نامیوں کے حق میں روس پہلے دن سے کھل کر آ گیا تھا۔ امریکہ وہاں ہزاروں میل دور سے آ کر لڑ رہا تھا۔ ویت نامی کسی دوسرے محاذ پر نہیں الجھے تھے۔ لیکن اس کے برعکس افغانی کئی سال تک امریکی حمایت سے محروم تھے۔ پھر جس سپر پاور کے خلاف وہ نبرد آزما تھے، وہ ہزاروں میل دور سے آ کر نہیں لڑ رہا تھا۔ بلکہ ان کی سرحد پر بیٹھا تھا۔ خود افغانیوں کی پشت پناہی کرنے والا پاکستان مشرقی سرحد پر بھارتی خطرے کی زد میں تھا۔ ان کا غمخوار جنرل ضیاء اندرونی

مشکلات کا بھی شکار تھا۔ سیاسی حمایت سے محروم جنرل کو اس خطے کی تاریخ کی سب سے بڑی ایسی دہشت گرد فورس الذوالفقار سے بھی واسطہ درپیش تھا، جسے پانچ ملکوں کے علاوہ اس ملک کی سب سے بڑی سیاسی جماعت کی پشت پناہی حاصل تھی۔ مگر ان تمام منفی عوامل کی موجودگی میں جنرل ضیاء نے وہ کچھ کر دکھایا، جو کوئی ہوچی منہ نہ کر سکا تھا، نہ کر سکے گا۔ ہوچی منہ کے ویت نام سے امریکہ صحیح سلامت نکل گیا۔ جنرل ضیاء کے چنگل سے روس نکلا تو ریزہ ریزہ ہو چکا تھا......

1978ء میں سرگودھا کے مقام پر جنرل ضیاء نے نیوکلیئر پروگرام کے تحفظ کے بارے میں جس یقین کے ساتھ اخباری نامہ نگار کی تسلی و تشفی کی تھی۔ وہ محض تسلی نہیں تھی، ایک وعدہ تھا۔ جو آنے والے دنوں میں انہوں نے پورا کر دکھایا۔ فرانس کو معاہدے کی منسوخی پر مجبور ہونا پڑا مگر جنرل تو آتے ہی سرگودھا میں کہہ گئے تھے کہ ہم فوج والے بہتری کی توقع رکھتے ہیں اور بدترین کے لئے خود کو تیار رکھتے ہیں۔ اس مسئلے پر انہیں بدترین صورت حال سے دوچار ہونا پڑا، لیکن پاکستان کے ایٹمی پروگرام کو انہوں نے اس طرح بچا کر پروان چڑھایا۔ جس طرح مرغی چیل کو دیکھ کر اپنے بچوں کو پروں کے نیچے سنبھال کر رکھتی ہے۔ یقین کے ساتھ ساتھ انہیں بصیرت کی نعمت خداوندی بھی حاصل تھی۔ وہ وطن کو درپیش خطرات وقت سے پہلے دیکھ لیتا تھا۔ اور ان کے تدارک کا فن بھی خوب جانتا تھا۔ پاکستان کے لئے خطرہ بننے والوں کو ایسے گھاؤ اور زخم لگایا گیا کہ کم از کم ایک آدھ نسل تک وہ اسے ضرور چاٹتے رہیں گے۔

سوویت یونین کی معاونت سے راجیو نے پاکستان پر چڑھائی کا ارادہ کیا تو جنرل ضیاء کرکٹ کا میچ دیکھنے بھارت پہنچے۔ واپس رخصتی کے وقت لوگوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ جنرل ضیاء بھارتی وزیراعظم راجیو گاندھی کو ایک طرف لے گئے۔ راجیو کی رعونت قابل دید تھی۔ جنرل ضیاء

نے ان کے کان میں ایک ایسی بات کہہ دی جس نے فرعونیت کے مہا تمائی پہاڑ کو روئی کا گالا بنا دیا۔انہوں نے راجیو سے کہا:

''راجیو صاحب! مہا تما گاندھی صرف بھارت کے نہیں موجودہ ہندو تہذیب کے بھی بانی ہیں۔وہ کہا کرتے تھے کہ اگر برصغیر کے تمام مسلمان ختم کر دیئے جائیں تو مسلم تہذیب تب بھی زندہ اور باقی رہے گی لیکن اگر برصغیر کے ہندو ختم کر دیئے جائیں تو پوری کی پوری ہندو تہذیب ختم ہو جائے گی۔کوئی اقدام کرنے سے پہلے اچھی طرح سوچ لیں کہ کہیں میں اس چیز کو استعمال کرنے پر ہی آمادہ نہ ہو جاؤں، جس سے برصغیر کے صرف مسلمان لیکن پوری کی پوری ہندو تہذیب مٹ جائے''۔

اتنا کہہ کر جنرل ضیاء رن وے پر کھڑے جہاز کی طرف چل پڑے۔ان کے ہمسفر ہموطنوں نے دیکھا کہ وہ راجیو جو چند لمحے قبل رعونت کا پہاڑ بن کر کھڑا تھا، ایک شکستہ اور بکھرا ہوا انسان نظر آ رہا تھا۔چند ساعتوں کے اندر اندر جنرل ضیاء کیا سے کیا کچھ کر گزرے تھے۔سب اس سے بے خبر تھے۔مگر منظر بڑا دلآ ویز تھا کیونکہ سپر پاور روس کے خلاف مغربی محاذ پر صف آرا جنرل ضیاء کرکٹ ڈپلومیسی کے نام سے منسوب ہونے والے دوسرے محاذ پر کوئی جنگی چال چلے یا ایک گولی داغے بغیر اپنے دوسرے حریف کو عبرت ناک پسپائی پر مجبور کر چکا تھا۔لیکن دشمن کا حصار توڑ کر اسے گھیرنے اور گھیرتے ہی چلے جانے کی عادت میں مبتلا جنرل محض ایک چھکے پر کہاں قناعت کر سکتا تھا۔وہ پاکستان واپس آئے تو نہایت رازداری کے ساتھ راجیو کے بھارت کے ساتھ وہ کچھ کر گئے کہ پاکستان کی سرحدوں کی جانب بڑھتے ہوئے بھارتی خود اپنے ہی وطن میں امرتسر تا سرینگر خاک کا رزق بنتے چلے گئے اور بن رہے ہیں۔

جہاد افغانستان کے عروج کے دنوں میں چھ روسی گن شپ ہیلی کاپٹر پاکستان میں گھس آنے

کے بعد زمین پر اتارے گئے۔ ہیلی کاپٹر کے عملے کے ارکان کو پوچھ گچھ کے لئے اسلام آباد لایا گیا تو دیکھا کہ ہر ایک کی جیب میں ایک ایک کاغذ تھا جس پر قرآنی آیات تحریر تھیں۔ پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ یہ ہمیں افغانی پائلٹوں نے دی ہیں کیونکہ ان کے بقول یہ جیب میں موجود ہوں تو مجاہیدن کے داغے گئے میزائل بے اثر رہتے ہیں۔ جنرل ضیاء کو اس واقعہ سے آگاہ کیا گیا تو ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ کہنے لگے میرا یہ اندازہ نہیں تھا کہ جہاد افغانستان قرآن کے منکروں پر قرآن کی حقانیت اور کیمیا گری بھی ثابت کر دے گا۔

بلاشبہ بعد کے سالوں میں انہوں نے جہاد افغانستان کے لئے امریکی امداد حاصل کی۔ ایک شاطر اور منصوبہ ساز جرنیل کی طرح انہوں نے اپنے ارادوں کی تکمیل کے لئے ہر اس طاقت اور فرد کو استعمال کیا، جو سودمند ثابت ہو سکتا تھا۔ آنے والے وقت نے ثابت کیا کہ یہ جنرل ضیاء یہ تھے، جنہوں نے امریکیوں کو استعمال کیا۔ جہاد افغانستان کے نتیجے ہی میں وسطی ایشیا کی مسلمان ریاستیں وجود میں آئیں۔ افغانستان میں پاکستان کے خلاف قائم دہشت گردی کے مراکز اور بھارتی جاسوسی کیمپوں کا خاتمہ ہوا۔ پاکستان گھیراؤ کی کیفیت سے نکل آیا۔ وہ زندہ رہتے تو شاید کہانی کچھ زیادہ ہی انمول ہوتی۔ وہ زندہ رہتے تو اس خطے کی تاریخ ہی نہیں جغرافیہ بھی مزید بدلا بدلا ہوتا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ بعد کے آنے والے مشتبہ پاکستانی حکمرانوں اور کوتاہ نظر افغان کمانڈروں کے کرتوتوں کے باوجود امریکیوں یا روسیوں کے حصے میں خسارہ ہی آیا۔ پاکستان اور اس خطے کے مسلمان بہت کچھ پا گئے اور عنقریب بہت کچھ پانے والے ہیں۔ انشاءاللہ۔

جنرل ضیاء نے امریکی امداد حاصل کرتے وقت قومی عزت و وقار اور خودمختاری کا بھی خوب پاس رکھا۔ امداد ان کی مرضی اور توقعات کے مطابق جب نہ تھی تو انہوں نے اسے مونگ پھلی کہہ کر ٹھکرا دیا۔ امریکی صدر کی بے عزتی کی جو مونگ پھلی کے کاشتکار تھے۔

1986ء کی بات ہے۔ایک دن مجھے اطلاع ملی کہ امریکی سفیر صبح صبح پشاور افغان گوریلا لیڈروں سے ملنے چلے گئے ہیں۔ میں نے حکام بالا کو آگاہ کیا۔تھوڑی دیر بعد جنرل ضیاء کے ملٹری سیکرٹری کا فون آیا اور کہا کہ ”جنرل کا حکم ہے کہ امریکی سفیر کو افغان مجاہد لیڈروں سے ملنے سے روکا جائے اور اگر وہ اس کے باوجود ملنے پر اصرار کریں تو پھر انہیں جنرل ضیاء کا یہ پیغام دیا جائے کہ ملاقات کے بعد وہ اسلام آباد آنے کی زحمت نہ کریں۔ سیدھا کابل تشریف لے جائیں“۔

امریکی سفیر کو پشاور کے مضافات میں روکا گیا۔انہیں جب مذکورہ پیغام دیا گیا تو سفیر موصوف پیغام دینے والے افسر کو ساتھ بٹھا کر وہیں سے اسلام آباد کے لئے واپس مڑا۔سیدھا آرمی ہاؤس پہنچا اور جنرل ضیاء سے ملتے ہی کہنے لگا ”مسٹر پریذیڈنٹ آپ کا یہ افسر گواہ ہے کہ میں افغان لیڈروں کو ملے بغیر ہی واپس آیا ہوں“ جنرل ضیاء نے ہلکا سا قہقہہ لگا اور کہا ”ایکسی لینسی! جو بھی امریکی میری اجازت کے بغیر افغان لیڈروں سے ملنے جائے گا، وہ اسی طرح ان سے ملے بغیر ہی واپس آئے گا“۔

میں نے جنرل ضیاء کے قتل کے حوالے سے 17 جولائی 1987ء کو ہی اپنے بعض انتہائی باخبر ایجنٹوں کے ذریعے موصول ہونے والی اطلاع کی بنیاد پر ایک رپورٹ بھیجی تھی۔ بعد میں میرے ہاتھ قاتلوں کے گریبان تک بھی پہنچ چکے تھے مگر میرے ہاتھ بہت ناتواں اور قاتلوں کے گریبان بہت مضبوط تھے۔

جنرل ضیاء قتل ہوئے اور انہیں قتل کرنے والے اپنی مرضی کے حکمران بھی بعد میں ہم پر مسلط کر گئے۔مگر سوال یہ ہے کہ کیا ایسا کرنے والے تاریخ اور جغرافیے کے پہیے کی وہ گردش روک سکے جسے جنرل ضیاء چلا کر گئے میرا جواب ہے کہ ایسا کرنے والے ناکام رہے۔ جنرل ضیاء

ساری عمر اپنے حریفوں کو حیران کرتے رہے۔ ان کے جنازے نے بھی انہیں حیران کر دیا۔ حیرانی کا یہ عمل ان کی شہادت کے بعد بھی جاری ہے۔

صدیوں پہلے تاتاری سرزمین سے ایک طوفان اٹھا اور عالم اسلام کو روندتا ہوا جب شام کے قریب پہنچا تو قدرت نے زنگی جرنیل اور امام تیمیہ کی صورت میں نہ صرف اس طوفان کا تعاقب کیا بلکہ خود اس خطرے اور طوفان کے اندر ہی سے کعبے کے پاسبان پیدا کیے۔

صدیوں بعد اسی تاتاری سرزمین سے ایک اور طوفان اٹھا اور وسطی ایشیا کے مسلمانوں سے لے کر افغانستان تک سب کچھ روندتا ہوا طورخم پر دستک دینے لگا تو قدرت کی نگاہ انتخاب پاکستان کے جنگی جرنیل اور افغانستان کے اماموں پر ٹھہری۔ دونوں کے ملاپ نے تاریخ کا عمل ایک بار پھر یوں دہرایا کہ نہ صرف طوفان کا رخ موڑ دیا بلکہ طوفان اور خطرے کے اندر سے ایک نہیں کئی پاسبان کعبہ پیدا کیے۔

کیا ہمارے دانشور اور ادیب اس صدی کے ایک عظیم مسلمان جرنیل کو اتنا بھی خراج پیش نہ کرسکیں گے جتنا وہ ہوچی منہ پر نچھاور کر گئے تھے۔ تاہم اگر وہ نہ بھی کریں تو تاریخ کے اوراق سے جنرل ضیاء کا نام غائب کرنے والے سوچ لیں کہ بدخشاں کے سربفلک پہاڑوں سے لے کر قندھار کے کھنڈرات اور ہرات کی جھونپڑیوں تک جنرل ضیاء کی آویزاں تصویروں کو ہٹانے کون آئے گا۔ یہ تصویریں آج بھی آویزاں ہیں اور آئندہ بھی آویزاں رہیں گی............

1991ء میں برادرم محترم محمد اعجاز الحق کے ساتھ دورہ کابل پر گیا۔ کابل کے ہوائی منظر سے پل خشتی کی جامع مسجد تک جو کچھ میں ن دیکھا، اسے نہ بیان کیا جاسکتا ہے، نہ اس کا تصور ممکن ہے۔ میں نے جنرل ضیاء کے بیٹے کو کابل میں افغانوں کے درمیان دیکھا۔ افغانی اعجاز الحق سے لپٹ رہے تے، ان پر ٹوٹ رہے تھے، زاروقطار رو رہے تھے۔ اعجاز الحق نعرہ تکبیر اور شہید

جہاد افغانستان زندہ باد کے فلک شگاف نعروں کی گونج میں مائیک پر آئے تو نہ اعجاز الحق کچھ کہہ سکے، نہ افغان کچھ سن سکے۔ دونوں طرف سے آنسوؤں کی سوغات تھی۔ صرف اور صرف ایک شخص کے لئے جو افغانوں کا ہی نہیں ان کی تاریخ کا بھی محسن تھا۔ افغان سرزمین پر لڑی جانے والی جنگ تاریخ کی جنگ تھی۔ روسیوں کی تاریخ تھی کہ جہاں بھی گھسے، واپس نہیں گئے۔ افغانیوں کی تاریخ تھی کہ جو بھی گھس آیا، زندہ وسلامت نہیں گیا۔ روس سے پہلے آخری بار گھسنے والا انگریز تھا جس کی بیس ہزار فوج میں سے صرف ایک ڈاکٹر برائیڈن بچا تھا۔ افغان سرزمین پر دراصل روسی اور افغانی تاریخ نبرد آزما تھی۔ افغان اور ان کی تاریخ سرخرو رہی۔ وہ فاتح نکلے۔ روسی اور ان کی تاریخ ہار گئے۔ پل خشتی کی جامع مسجد میں افغانوں کے درمیان ان کا اور ان کی تاریخ کے محسن کی نشانی ساتھ کھڑے تھے۔ اعجاز الحق، جنرل ضیاء کی باقیات اور جنرل ضیاء کی علامت کی حیثیت سے موجود تھا۔ وہ عظیم جرنیل کی خواہش کی تکمیل کے لئے ہی تو پل خشتی کی جامع مسجد میں نوافل پڑھنے گیا تھا۔ افغان محمد اعجاز الحق کو محبتوں، نعروں اور آنسوؤں کے ساتھ ایک ہی بات باور کرا رہے تھے، یاد دلا رہے تھے، تم جنرل ضیاء کے بیٹے ہو، انہی کے بیٹے بن کر رہو۔ وہ جنرل ضیاء جو پاکستان کا حکمران نہیں بلکہ عصر حاضر کا سب سے بڑا اور سب سے خطرناک مسلمان جرنیل تھا۔ ایسا جرنیل جس نے ممولے کو شہباز سے لڑایا، دشمنوں کو تگنی کا ناچ نچایا، انہونی کو ہونی کر دکھایا، مسلمانوں کی تاریخ کو پھر سے بنایا، یہ تھے جنرل ضیاء......

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے